جاری کردہ
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ
ترجمان القرآن

جولائی ۱۹۹۵

مدیر: خرم مراد

ادارۂ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خرم مراد

جلد ۱۲۱ | جولائی ۱۹۹۵ صفر ۱۴۱۶ | عدد ۷

فہرست مضامین

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۔ ۵۴۵۷۰

فون: ۷۵۷۔۱۲۴

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور

۵۔اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور

فون ۷۵۸۷۹۱۶ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ -/۱۲ روپے

زر سالانہ -/۱۲۰ روپے

مشرق وسطیٰ -/۵۵۰ روپے

بنگلہ دیش، مسقط -/۵۰۴ روپے

بھارت -/۳۰۰ روپے

یورپ، مشرق بعید -/۶۵۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/۹۰۰ روپے

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

۶۰ سال پہلے

بادی النظر میں تو یہ حملہ صرف اوقات نماز ہی پر ہے لیکن غور سے دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ یہ ایک بڑے خطرے کی ابتدا ہے۔ مسلمانوں کو پنج وقتہ نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب قریب اسی تواتر کے ساتھ پہنچی ہے جس کے ساتھ قرآن پہنچا ہے۔ جس طرح قرآن کی صحت پر ہمارا یقین و اذعان محض اس بنا پر ہے کہ اس کتاب کو ہزاروں آدمیوں نے حضور ؐ سے سنا اور پھر لاکھوں کروڑوں آدمیوں نے صحابہ سے سنا اور ان کے بعد ہر گذرنے والی نسل سے آنے والی نسل کو قرآن انھی الفاظ کے ساتھ پہنچتا رہا' اسی طرح پنج وقتہ نماز کی فرضیت پر یقین کرنے کے لیے بھی ہمارے پاس اس سے زیادہ مضبوط اور مستحکم کوئی ثبوت نہیں ہے کہ ہزاروں آدمیوں نے آنحضرت ؐ سے پنج وقتہ نماز کا حکم سنا اور آپ کے اقتدا میں اس پر سالہا سال تک عمل کیا   اس تواتر سے جو یقین نماز کے معاملے میں حاصل ہوتا ہے' وہ اگر کسی شک ڈالنے والے کے شک ڈالنے سے متزلزل ہو جائے تو پھر اس یقین کو متزلزل کر دینا بھی کچھ مشکل نہیں جو قرآن مجید کے متعلق اسی تواتر سے حاصل ہوا ہے۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایسی متواتر خبر بھی شک و شبہ کی زد میں آسکتی ہو تو ایک شخص اس امر میں بھی شک کر سکتا ہے کہ آیا محمد ؐ فی الواقع مبعوث بھی ہوئے تھے یا نہیں

باطل کی طرف دعوت دینے والوں کا یہ عام قاعدہ ہے کہ وہ اپنی دعوت ضلالت کے تمام مقاصد کو بیک وقت بے نقاب نہیں کرتے بلکہ سب سے پہلے دین کے مسلّمات و یقینیات میں سے کسی ایک چیز پر حملہ کر کے اپنی پوری قوت صرف اسی کو متزلزل کرنے میں صرف کر ڈالتے ہیں۔ یہ ایک گہری نفسیاتی چال ہے۔ اگر وہ سب کچھ ابتدا ہی میں کھول دیں تو شاید کوئی مسلمان بھی ان کے جال میں نہ پھنسے۔ اس لیے وہ اپنے کام کی ابتدا شکوک و شبہات کی تخم ریزی اور یقینیات میں سے کسی ایک امر یقینی کی بنیاد ڈھانے سے کرتے ہیں۔ جو لوگ اس پہلے حملے کے مقابلے میں ثابت قدم رہ جاتے ہیں ان کا دین و ایمان تو ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن جو کمزور طبیعت کے لوگ اس حملے کی تاب نہیں لا سکتے وہ پہلے مورچے پر شکست کھانے کے بعد ایسے مغلوب ہوتے ہیں کہ گمراہ کرنے والا ان کے یقینیات میں سے ایک ایک کو مسمار کرتا چلا جاتا ہے' اور وہ گمراہی کی آخری منزل تک اس کی پیروی کیے چلے جاتے ہیں۔

(ابوالاعلیٰ مودودی' جلد ۶' عدد ۴' جولائی ۱۹۳۵)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

خرم مراد

کراچی کا خونیں شہر ایک عام آدمی کے لیے آج سب سے زیادہ تشویش ناک مسئلہ بنا ہوا ہے: امن و امان کی تباہی کا مسئلہ 'روز گرنے والی لاشوں کا مسئلہ 'پاکستان کے دروازے اور سب سے خوش حال شہر کی بربادی کا مسئلہ 'ملک کی سلامتی کو خطرے کا مسئلہ۔ زبان پر ایک ہی سوال ہے: کراچی کے مسئلے کا کیا حل ہے 'کیا یہ حل ہو گا 'ملک کا کیا بنے گا 'کراچی کو بچانے کے لیے کچھ تو کیجیے!

عام آدمی کی تشویش بے جا نہیں ہے۔ پہلے تعطل کے طویل وقفے ہو جاتے تھے 'اب تو تقریباً روز ہی ایک درجن کے قریب لوگ موت کے گھاٹ اتارے جا رہے ہیں۔ ان میں بے گناہ بھی ہیں 'اور عورتیں بچے بھی۔ مخالفین کو اغوا کر کے اور بدترین اذیتیں دے کر مارا جا رہا ہے۔ ایک ڈاکٹر کا کہنا ہے: "ہمارے پاس ایک لاش لائی گئی جس میں پچاس گولیاں پیوست تھیں اور اس کے جسم کا ہر حصہ کٹا پٹا تھا 'ایک کی رانوں میں ڈرل سے سوراخ کیے ہوئے تھے 'ایک کی آنکھیں ناخنوں سے نوچ کر نکالی ہوئی تھیں 'ایک کے چہرے میں اتنی گولیاں اتاری ہوئی تھیں کہ وہ بالکل مسخ ہو چکا تھا"۔ پچھلے ڈیڑھ سال میں ۱۶ سو لاشیں ہسپتالوں میں لائی گئی ہیں 'جو نہیں لائی گئیں وہ الگ ہیں۔ اسی طرح لوگوں کے گھر اور مال بھی ڈاکوؤں کے لیے کھلی چراگاہ بنے ہوئے ہیں 'جہاں چاہیں گھس جائیں اور لوٹ لیں۔ پیشہ ور اور سیاسی ڈاکوؤں کے ساتھ 'بدقسمتی سے امن کے محافظ بھی اسی کام میں مشغول ہیں۔ مہاجرین کے دونوں گروہوں نے کراچی کے ایک بڑے حصے کی عمل داری کو آپس میں تقسیم کر لیا ہے۔ جس شخص 'کارخانے 'یا پورے بازار پر 'جتنا خراج چاہیں عائد کر دیں 'جس کو جان بچانا ہو اسے دینا ہی پڑتا ہے۔

سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ اب پولیس 'رینجرز اور فوج کے خلاف کھلم کھلا حملے ہو رہے ہیں: ان کے افسر اور سپاہی ہلاک کیے جا رہے ہیں 'تھانوں پر گولیاں برسائی جا رہی ہیں 'ان کی گاڑیاں

جلائی جا رہی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اب وہ متاثرہ آبادیوں کے اندر داخل بھی نہیں ہو سکتے ' صرف بڑی بڑی شاہراہوں پر گشت کرتے ہیں۔ یہ حملے حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کے آغاز کا سگنل بھی ہیں' اور فوج اور رینجرز کی بعض کارروائیوں کے خلاف نفرت کا اظہار بھی۔ ۱۹۹۲ میں جب فوجی آپریشن شروع ہوا تھا اسی وقت ہم نے واضح کر دیا تھا کہ اسے کامیابی عوامی حمایت کے بغیر حاصل نہیں ہوگی' حمایت اسی صورت میں ملے گی جبکہ دل سوزی اور شفقت 'مکمل غیر جانب داری اور انصاف کے ساتھ آپریشن کیا جائے گا' اور شہریوں کی عزت و احترام کو ملحوظ رکھا جائے گا' صرف مجرموں کو پکڑا جائے گا' اور کارروائی جلد از جلد ختم کر دی جائے گی۔ بدقسمتی سے ان میں سے ہر اصول کی خلاف ورزی کی گئی۔ چنانچہ دلوں میں نفرت پیدا ہوگئی' ایم کیو ایم اگر ظالم تھی تو وہ بالکل مظلوم بن گئی۔ کسی بھی فوج کے لیے' اور ہماری فوج کے لیے تو اپنے احساس برتری اور دور غلامی کے رویوں کے ساتھ خاص طور پر' ایک شہر میں امن و امان قائم کرنا بہت مشکل ہے' لیکن جب مقامی آبادی بھی مخالف ہو' تو ملبوں اور لاشوں کا ڈھیر تو لگایا جا سکتا ہے' آبادی کو قابو میں نہیں لایا جا سکتا۔ قابو پا بھی لیا جائے' تو مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

ہم مایوس نہیں ہیں' اور مایوسی کو کفر سمجھتے ہیں۔ لیکن طفل تسلیوں سے دل بہلانا بھی کوئی دانش مندی نہیں ہے۔ حقیقت سے چشم پوشی کے بجائے اس کے صحیح ادراک سے ہی بہتری کا راستہ کھل سکتا ہے۔ اس لیے ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ حالات جس رخ پر جا رہے ہیں انھیں دیکھتے ہوئے ہمیں کراچی کا مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ وجہ یہ نہیں ہے کہ حالات قابو سے باہر ہو چکے ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ کوئی حل موجود نہیں۔ نہیں' حل موجود ہے' اور حالات پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا ہونا اس لیے ممکن نظر نہیں آتا کہ جن لوگوں کے پاس اسے حل کرنے کی ذمہ داری اور اصل اختیار ہے --یعنی پیپلز پارٹی' ایم کیو ایم اور فوج-- ان میں سے ہر ایک فریق اسے صرف اپنی شرائط پر اور اپنی مرضی کے مطابق حل کرنا چاہتا ہے۔ اس روش کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ تصادم شدید سے شدید تر ہوتا چلا جائے' اور یہی کچھ ہو رہا ہے۔ جب تک دو اصل فریق کچھ نہیں کرتے اس وقت تک کوئی دوسری سیاسی قوت بھی موثر کردار ادا نہیں کر سکتی: ہاں' اہل وطن کھڑے ہو جائیں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں: فریقین کو مجبور بھی کر سکتے ہیں کہ وہ مطلوبہ اقدامات کریں' نہ کریں تو انھیں اٹھا کر الگ کر سکتے ہیں' لیکن وہ فی الحال تشویش کے اظہار کے علاوہ اور کچھ کرنے کے لیے آمادہ نظر نہیں آتے۔ اس وجہ سے بھی ہم یہ کہتے ہیں کہ مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آتا' کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت ثابتہ یہ ہے کہ "وہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی حالت خود نہ بدلے"۔

کراچی کے بارے میں جتنی تشویش ہے بجا ہے' لیکن ہمیں اصل تشویش اس پر ہے کہ ملک — کئی پہلوؤں سے' مگر خاص طور پر کراچی کے معاملے میں — ایک بند گلی میں کھڑا ہوا ہے۔ جن کے پاس کنجیاں ہیں کہ دروازے کھولیں' روشنی آنے دیں' اور نکلنے کے راستے بنائیں' وہ مزید تالے چڑھاتے چلے جا رہے ہیں۔ عمداً یا خطاءً' یہ ایک الگ بحث ہے۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ دونوں فریق جان بوجھ کر مسئلے کو حل کرنے کے بجائے اس کو بگاڑ رہے ہیں' اس لیے کہ دونوں غدار اور دشمن کے ایجنٹ ہیں' اور ۱۹۷۱ کی طرح اسے دولخت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ یہ فرد جرم صرف پیپلز پارٹی پر عائد کرتا ہے' اور' ایم کیو ایم کے ماضی کے کردار کے لیے عذر تلاش کر کے' اسے قومی دھارے میں شامل کرنے کے لیے اپوزیشن کی گرینڈ الائنس میں شامل کرنے کا حامی ہے۔ دوسرا گروہ سارا جرم ایم کیو ایم کا گردانتا ہے۔

پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کا ماضی کا کردار یقیناً داغ دار ہے' لیکن اس معاملے میں ہم دینی لحاظ سے' اور قومی سیاسی اخلاق کے لحاظ سے بھی' اسی اصول پر کاربند رہنا صحیح سمجھتے ہیں جو سید مودودی کا اصول تھا۔ جب لیاقت علی خاں مرحوم نے سہروردی صاحب کو غدار کہا تو سب سے پہلے انھی کی صدائے احتجاج بلند ہوئی کہ غداری سب سے بڑا اور گھناؤنا جرم ہے' اور بغیر ثبوت کسی کو کسی پر الزام نہیں لگانا چاہیے۔ بدقسمتی سے آج بھی یہ جرم بغیر ثابت کیے ہی لگایا جا رہا ہے۔

اگر اس الزام میں حقیقت ہو' تب بھی ہمیں ان دونوں کے اعلانات کو قبول کرتے ہوئے' انھیں ملک کا وفادار سمجھتے ہوئے ہی آگے بڑھنا ہو گا۔ اس لیے کہ جو پارٹی عوام کے دلوں میں گھر کیے ہوئے ہو اور ان کی منتخب کردہ ہو' اس پر صرف غداری کا الزام لگا کر اسے قومی زندگی سے باہر نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی صورت میں' ہمیں اس وقت کا انتظار کرنا ہو گا جب عوام بھی ان کی حقیقت پہچان لیں' پھر یا تو وہ انھیں کچھ کرنے پر مجبور کریں' یا انھیں اٹھا کر پھینک دیں۔ ورنہ' اگر یہ الزام صحیح ہو کہ پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم دونوں جان بوجھ کر ملک توڑنے پر تلی ہوئی ہیں' تو ملک پر فاتحہ پڑھنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔

ہمارے نزدیک بند گلی سے باہر نکلنا اسی وقت ممکن ہے جب ملک کی ہر قوت چار باتوں کو تسلیم کرے' جو ہر ایک کے نزدیک مسلمہ ہیں' اور جن سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔

ایک بات یہ کہ موجودہ حالات میں کراچی کا مسئلہ پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم دونوں ہی مل کر حل کر سکتے ہیں' ان دونوں کے بغیر حل کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ اس حقیقت کو ان دونوں پارٹیوں کو بھی

تسلیم کرنا چاہیے، اور ملک کی دوسری قوتوں کو بھی۔ یہ تسلیم کرنے کے معنی یہ نہیں کہ ان پارٹیوں کے ماضی یا مستقبل کو جواز کا سرٹیفکیٹ دیا جا رہا ہے۔ بلکہ یہ اس لیے ضروری ہے کہ صرف یہ دونوں ہی سندھ کے لوگوں کی بہت بھاری اکثریت کے درمیان مقبول و محبوب ہیں، انھی کو ان کا اعتماد حاصل ہے۔ یہی ان کی واحد نمایندہ ہیں۔ اور اس لیے بھی کہ دونوں کا دائرہ اثر بالکل الگ الگ ہے: پیپلز پارٹی کا دائرہ اثر قدیم سندھیوں اور دیہی علاقوں پر مشتمل ہے، جبکہ ایم کیو ایم کا مہاجرین اور شہروں پر، جن میں سب سے بڑا شہر کراچی ہے۔ دائرہ اثر کی یہی واضح تقسیم مسئلے کی جڑ ہے، اور ایک دوسرے کو تسلیم کرنے کی متقاضی بھی۔

دوسری بات یہ کہ یہ مسئلہ اسی وقت حل ہو سکتا ہے جب پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم ایک دوسرے کو برداشت کریں، باہمی رواداری برتیں، آپس میں مفاہمت کریں، اور دونوں مل کر سندھ پر حکومت کریں۔ جس طرح آج پیپلز پارٹی نے ایم کیو ایم کو ہر سطح پر حکومت سے باہر کر رکھا ہے، اور اسے دہشت گرد اور ملک دشمن قرار دے کر اس کے خلاف محاذ آرائی کر رہی ہے، یا جس طرح جنرل ضیاء الحق اور جام صادق نے پیپلز پارٹی کو حکومت سے باہر رکھا اور اس کے خلاف محاذ آرا رہے، اس کا انجام کم سے کم سندھ میں مسلسل عدم استحکام اور بدامنی کے علاوہ نہ کچھ ہوا ہے، نہ ہو گا۔

دونوں کے حلقہ اثر کے بالکل الگ الگ ہونے، اور اپنے حلقے کا واحد نمایندہ ہونے ہی کی وجہ سے مفاہمت اور مشترک حکومت کے علاوہ امن و آشتی کی اور کوئی صورت نہیں۔ بلکہ یہ نہ ہو تو الگ ہونے کا خطرہ بھی سنگین ہو جاتا ہے۔ ہمارے سامنے دو نظائر ہیں۔ ۱۹۴۶ میں برصغیر میں، اور ۱۹۷۱ کے پاکستان میں بھی یہی صورت حال تھی۔ پبلک اور مینڈیٹ، دو مختلف پارٹیوں کے درمیان منقسم تھے، دونوں کی مفاہمت اور مشترک حکومت ممکن نہ تھی، جو نتیجہ نکلا وہ ہمارے سامنے ہے۔ اکثر لوگ کراچی کی صورت حال کو ۱۹۷۱ کے پاکستان سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ہمارے خیال میں دونوں میں بہت فرق ہے، اور ۱۹۷۱ کی طرح الگ ہو جانا فی الحال قرین قیاس نہیں۔ لیکن مفاہمت اور مشترک حکومت نہ ہوئی، تو کیونکہ اب علیحدگی دشوار ہے، اس لیے مسلسل عدم استحکام اور خون ریزی جاری رہے گی۔ اگر کراچی سندھ سے الگ ہوا بھی، تو بھی خون ریزی سے مفر نہیں، شاید تقریباً ۱۹۴۷ اور ۱۹۷۱ کی طرح۔ ویسے علیحدہ صوبہ کا حل تو ایوب خاں اور یحییٰ خاں عرصہ ہوئے اپنی حماقتوں سے دفن کر چکے، اب اس کو زندہ کرنے کی گراں قیمت ملک ادا نہیں کر سکتا۔

اس سلسلے میں یہ تسلیم کرنا بھی سب کے لیے ضروری ہے کہ جس گروہ کو عوامی مقبولیت حاصل ہو، اسے ختم کرنے کے دو ہی راستے ممکن ہیں: تشدد اور اسلحے کے ذریعے، یا رائے عامہ کے ذریعے۔

تشدد مشکل سے کامیاب ہوتا ہے' پاکستان کی اسلامی جمہوری ریاست میں صرف دوسرا ہی راستہ ممکن ہے' اور یہی ملک کے مفاد میں ہے۔ پیپلز پارٹی کو جاننا چاہیے کہ وہ ایم کیو ایم کو' (یا نواز مسلم لیگ اور بنیاد پرستوں کو)' تشدد کے ذریعے' یا اس کو حکومت اور سیاست سے باہر رکھ کر' لوگوں کے دلوں اور سیاسی نقشے سے کھرچ کر ختم نہیں کر سکتی۔ بلکہ اس کی اور فوج کی روش سے اس کا نقش روز بروز گہرا ہو رہا ہے۔ اسی طرح ایم کیو ایم بھی' اپنی محاذ آرائی سے پیپلز پارٹی کو ختم نہیں کر سکتی۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم اور جام صادق کی کوششوں کا انجام اس حقیقت پر دلیل ہے۔

اسی طرح اگر کوئی تیسری قوت چاہتی ہو کہ' موجودہ سیاسی منظر میں' ایم کیو ایم کے ذریعے پیپلز پارٹی کی حیثیت ختم کر دے' (جیسے نواز مسلم لیگ)' یا پیپلز پارٹی کے ذریعے ایم کیو ایم کو ختم کر دے' (جیسے فوج)' تو یہ ناممکن بھی ہو گا اور خطرناک بھی۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کو ختم کرنے کے لیے کراچی کو میدان جنگ بنانے کی قیمت بہت گراں ہوگی' اس مقصد کے لیے کوئی دوسرا میدان جنگ منتخب کرنا چاہیے۔ ہمارے نزدیک تو بے نظیر حکومت کے خلاف عدم اعتماد کے لیے ایم کیو ایم کو پیپلز پارٹی سے الگ کرنے کا اقدام بھی غیر دانش مندانہ تھا۔ اسی طرح ایم کیو ایم کو سیاسی طور پر ختم کرنے کی بھی بھاری قیمت ادا کی جا چکی ہے' اب مزید کی گنجایش نہیں ہے۔

جب فی الحال دونوں پارٹیوں کو منظر پر رہنا ہے' تو ان کو بھی' اور دوسری سیاسی قوتوں کو بھی اس بات کی کوشش کرنا چاہیے کہ اس وقت ان دونوں کی مشترک حکومت قائم ہو۔ اگرچہ یہ اہتمام بھی ضروری ہے کہ دونوں کے اشتراک سے پیپلز پارٹی کو حزب اختلاف کو مزید کچلنے کا لائسنس نہ ملے۔ جو لوگ ایم کیو ایم کو اس کے ماضی کے کردار کے باوجود' قومی دھارے میں لانا چاہتے ہیں' وہ بے شک پیپلز پارٹی کو اقتدار سے باہر کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں' مگر کسی بھی سیاسی قوت کو قومی دھارے سے باہر کرنے کا نہ سوچیں۔

تیسری بات یہ کہ مفاہمت کا عمل صرف پرامن بات چیت سے پروان چڑھ سکتا ہے' تشدد' ظلم و تعدی' ضد اور ہٹ دھرمی' اور دھمکیوں سے نہیں۔ ایم کیو ایم جب ہتھیار استعمال کرنے اور دہشت گردی کرنے ہی سے انکاری ہے تو وہ یہ شرط کیسے تسلیم کر سکتی ہے کہ بات چیت سے پہلے ہتھیار رکھ دے اور دہشت گردی ترک کر دے۔ یہ شرط تسلیم کرنا تو اقبال جرم کے مترادف ہو گا۔ پھر حکومت آج تک کسی دہشت گردی اور قتل میں ایم کیو ایم کا ہاتھ ثابت کرنے میں کامیاب بھی نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے ایسی پیشگی شرط دراصل مذاکرات نہ کرنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح ایک بااختیار ٹیم مقرر کرنے کا مطالبہ بھی بے معنی ہے۔ کسی پارٹی میں بھی واحد لیڈر کے سوا کوئی بھی مکمل طور پر بااختیار نہیں

ہو سکتا۔ معنی خیز بات چیت تو الطاف حسین صاحب ہی کر سکتے ہیں 'مگر وہ در یں حالات پاکستان میں داخل ہونے کی حماقت نہیں کر سکتے۔ اس لیے 'اگر بات چیت ضروری ہے تو' یہ حکومت ہی کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان سے بات چیت کا کوئی طریقہ نکالے۔

ہم ایم کیو ایم کے اس مطالبے کو صحیح نہیں سمجھتے کہ بات چیت سے پہلے 'یا اس کے نتیجے میں' اس کے کارکنوں کے خلاف سارے مقدمات واپس لے لیے جائیں۔ ملزمین کو اس طرح کوئی بھی حکومت نہیں چھوڑ سکتی۔ لیکن حکومت جس پیمانے پر اپنے مخالفین کے خلاف مقدمات بنا رہی ہے' اور ان کو سیاسی انتقام کا نشانہ بنا رہی ہے' اور جس طرح اس نے عدالتی نظام کی غیر جانب داری کو مجروح کر دیا ہے' اس کو دیکھتے ہوئے' اس کے بظاہر مبنی بر حق اس مطالبے میں کوئی جان نہیں کہ آؤ اور مقدمات کا سامنا کرو۔ یہ بھی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے اقدامات کرے جن سے مقدمات کی تفتیش عدالتی کارروائی اور فیصلوں کے بارے میں عدل و انصاف یقینی ہو' اور یقینی نظر آئے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ملزم' جب تک جرم ثابت نہ ہو' مجرم نہیں بے گناہ ہیں۔ اور بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ حکومتوں نے دہشت گردی کرنے والوں سے نہ صرف بات چیت کی ہے 'بلکہ ان کو معافی بھی دی ہے۔

چوتھی بات یہ کہ کوئی بات چیت اور مفاہمت اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک دونوں طرف سے فراخ دلی' خیر سگالی' کسر و انکسار اور کچھ دو کچھ لو کی روش اختیار نہ کی جائے۔ اگر ہر ایک کو اپنے ہی مقام پر ڈٹے رہنا ہے تو مذاکرات کی میز پر بیٹھنا لاحاصل ہے۔

بدقسمتی سے ان چاروں مسلم امور کا احساس مفقود نظر آتا ہے۔ پیپلز پارٹی کی طرف سے مسلسل غیر ثابت شدہ الزامات' دہشت گرد اور ملک دشمن کی گالیاں ہیں ''بغاوت'' کے خلاف گرینڈ آپریشن اور مکمل استیصال کی دھمکیاں ہیں۔ دوسری طرف ایم کیو ایم کی جانب سے الٹی میٹم ہیں' مطالبات کے مانے جانے پر اصرار ہے' کراچی میں قتل و غارت گری کی وہ کارروائیاں ہیں جن کے بارے میں' واضح ثبوت نہ ہونے کے باوجود' لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کا دامن ان سے پاک نہیں۔

اگر دونوں نے' اور ملک کی دیگر سیاسی قوتوں نے' ان حقیقتوں کو تسلیم کر کے اپنا کردار ادا نہیں کیا' تو انھیں جاننا چاہیے کہ کراچی میں مسلسل خون بہتا رہے گا' اور ملک مسلسل سیاسی عدم استحکام اور معاشی بدحالی کا شکار رہے گا۔ یہ سلسلہ بہت طویل بھی ہو سکتا ہے۔ ہمیں کسی بیرونی طاقت سے فی الحال یہ خطرہ نہیں ہے کہ کراچی کو ایک ہانگ کانگ بنا دے اس کے لیے نہ امکانات ہیں نہ حالات لیکن یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ وہ لمبے عرصے کے لیے ایک بیروت بنا رہے' تاکہ پاکستان عدم استحکام کا شکار رہے اور اس کی واحد بندرگاہ بدامنی اور خون ریزی میں مبتلا' اور اس طرح ان کے دباؤ میں رہے اور ان کی

مرضی کا تابع۔ کراچی کی جو صورت حال ہے اس کے ہوتے ہوئے' کون سی حکومت کسی بیرونی طاقت کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کر سکتی ہے۔

دونوں پارٹیوں کی مشترک حکومت' کراچی کی بگڑتی ہوئی صورت حال کا واحد فوری اور ممکن حل ضرور ہے' لیکن حقیقی حل نہیں۔ اس لیے کہ اگر پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم' اپنے کردار اور نظریات میں تبدیلی نہ لائیں' تو اس کا قوی امکان ہے کہ یہ اپنے مخالفین کو کچلنے' ایک غیر جمہوری اور غیر اسلامی معاشرے کو فروغ دینے' اور پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو کمزور کرنے کا باعث بنیں گی۔ لیکن اس کا علاج نہ جمہوری عمل کو زبردستی روکنا ہے' نہ فوج کی مداخلت ہے۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ پاکستان کو اسلامی اور جمہوری بنانے کے لیے اخلاص کے ساتھ کوشاں قوتیں' رائے عامہ کو اپنے ساتھ لیں' پایدار اور واضح بنیادوں پر اشتراک عمل کی راہ تلاش کریں' اور آیندہ انتخابات کے جلد اور منصفانہ ہونے کو یقینی بنائیں۔

ملی یک جہتی کونسل کی صورت میں دینی راہ نماؤں کے اتحاد نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے' جیسا ہم نے کراچی کے لیے تجویز کیا ہے' کہ جن لوگوں کے پاس مسئلے کو حل کرنے کا اختیار ہے وہ سنجیدگی سے کوشش کریں تو ہر مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اس معاملے میں جن ملاؤں کو "فی سبیل اللہ فساد" کے لیے زور شور سے بدنام کیا گیا ہے' مغربی ملاؤں سے بازی لے گئے ہیں۔

مذہب کے نام پر فساد اور خون ریزی کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے' لیکن ہمارا ہمیشہ خیال یہ رہا ہے کہ حکومت اور میڈیا نے گذشتہ دنوں میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کو' صرف اسلام اور علما کے خلاف عام لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا کرنے کے لیے وسیع پیمانے اور زور و شور سے اچھالا۔ ورنہ صرف کراچی کی صورت حال یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ سیاسی اور لسانی خون ریزی کے مقابلے میں مذہب کے نام پر خون ریزی کچھ بھی نہیں۔ لیکن اس داغ کو بھی' ملک کی تمام قابل ذکر دینی جماعتوں پر مشتمل ملی یک جہتی کونسل نے اپنے اقدامات سے دھو دیا ہے۔ فرقہ وارانہ امن و آشتی قائم کرنے میں کونسل نے جو شاندار کامیابی حاصل کی ہے اس پر اللہ کا جتنا شکر ادا کیا جائے' کم ہے۔ اس اتحاد میں شیعہ اور سنی' دیوبندی اور بریلوی' سپاہ صحابہ اور تحریک فقہ جعفریہ اور سپاہ محمد سب شامل ہیں۔ اس کونسل کے قیام کے بعد پورا عرصہ امن چین سے گزرا ہے' اور محرم کا پہلا عشرہ بھی سلامتی کے ساتھ گزر گیا۔

یہ اتحاد اتنا ہی مثالی اور تاریخی ہے جتنا اسلامی دستور کے ۲۲ نکات پر ۳۱ علما کا اجماع تھا۔ اللہ تعالٰی سے دعا ہے کہ ملت کے دینی راہ نما پورے اخلاص کے ساتھ کام کریں' اس کونسل کو افتراق و انتشار سے پاک رکھیں' متحد رہیں' اور دینی مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔ ہمیں امید ہے' جیسا کونسل کے راہ نماؤں نے اعلان کیا ہے' کہ وہ اس اتحاد کو ملکی سیاست میں ایک فریق نہ بنائیں گے' اور کسی پارٹی کو مسند اقتدار پر بٹھانے یا اس سے ہٹا لینے کو اپنا مقصد نہ قرار دیں گے۔ یہ اتحاد کے بقا کے لیے ناگزیر ہے۔

ملی یک جہتی کونسل نے اتفاق رائے سے ایک ضابطہ اخلاق بھی طے کیا ہے۔ ضابطہ انتہائی اہم اور دور رس نکات پر مشتمل ہے۔ اور فرقہ وارانہ یک جہتی کے لیے ایک مستقل اور مستحکم بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اس ضابطے کے اہم نکات حسب ذیل ہیں:

- اختلافات اور بگاڑ کو دور کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ تمام مکاتب فکر' نظم مملکت اور نفاذ شریعت کے لیے ایک بنیاد پر متفق ہوں' اور یہ بنیاد ۳۱ سرکردہ علما کے ۲۲ نکات ہیں۔
- مذہب کے نام پر دہشت گردی اور قتل و غارت گری اسلام کے خلاف ہے' اس کی پرزور مذمت اور اس سے اظہار برات کریں گے۔ اسی طرح کسی بھی اسلامی فرقے کو کافر اور اس کے افراد کو واجب القتل قرار دینے کو غیر اسلامی اور قابل نفرت فعل قرار دیتے ہیں۔
- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ہمارے ایمان کی بنیاد ہے' اسی طرح' اہل بیت اطہار و امام مہدی کی' ازواج مطہرات' صحابہ کرام و خلفاے راشدین کی عظمت بھی ایمان کا جز ہے۔ ان کی تکفیر کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہے' اور ان کی توہین و تنقیص حرام اور قابل مذمت و تعزیر جرم ہے۔
- ایسی ہر تقریر و تحریر سے گریز و اجتناب کیا جائے گا جو کسی بھی مکتبہ فکر کی دل آزاری اور اشتعال کا باعث بن سکتی ہے۔ اس ضمن میں خاص طور پر شرانگیز اور دل آزار کتابوں' پمفلٹوں اور تحریروں' اشتعال انگیز اور نفرت انگیز مواد پر مبنی کیسٹوں' دل آزار' نفرت آمیز اور اشتعال انگیز نعروں' اور دیواروں' ریل گاڑیوں' بسوں اور دیگر مقامات پر دل آزار نعرے اور عبارتیں لکھنے پر پابندی عائد ہوگی اور ان سے مکمل اجتناب و احتراز کیا جائے گا۔
- تمام مسالک کے اکابرین کا احترام کیا جائے گا' اور ان کے مقامات مقدسہ اور عبادت گاہوں کا احترام و تحفظ یقینی بنایا جائے گا۔ جلسوں' جلوسوں' مساجد اور عبادت گاہوں میں اسلحے خصوصاً غیر قانونی اسلحے کی نمائش نہیں کی جائے گی۔

○ عوامی اجتماعات اور جمعہ کے خطبات میں ایسی تقریریں کی جائیں گی جن سے مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا ہو اور 'عوامی سطح پر ایسے اجتماعات منعقد کیے جائیں گے جن سے تمام مکاتب فکر کے علما بیک وقت خطاب کر کے ملی یک جہتی کا عملی مظاہرہ کریں۔

○ مختلف مکاتب فکر کے متفقات اور مشترکہ عقائد و نکات کی تبلیغ اور نشرواشاعت کا اہتمام کیا جائے گا۔

○ باہمی تنازعات کو افہام و تفہیم اور تحمل و رواداری کی بنیاد پر طے کیا جائے گا۔

○ ضابطہ اخلاق کے عملی نفاذ کے لیے ایک اعلیٰ اختیاراتی بورڈ تشکیل دیا جائے گا جو اس ضابطے کی خلاف ورزی کی شکایات کا جائزہ لے کر اپنا فیصلہ صادر کرے گا اور خلاف ورزی کے مرتکب کے خلاف کارروائی کی سفارش کرے گا۔

۱۹۹۶-۱۹۹۵ کا بجٹ پیش کرنے کی بے جان رسم ادا ہو چکی ہے۔ بجٹ عام آدمی کے لیے کسی امید' خوشی یا روشن مستقبل کا مژدہ نہیں لاتا۔ بلکہ یہ ٹیکسوں میں تھوڑی سی کمی اور ڈھیر سارے اضافے' عام آدمی کی پیٹھ پر بوجھ میں بھی اسی تناسب سے کمی بیشی' اور معمول کے اخراجات اور ترقیاتی منصوبوں کا نام بن کر رہ گیا ہے۔ ۱۹۴۷ سے نہ اس کے سانچے میں کوئی ظاہری یا بنیادی تبدیلی آئی ہے' نہ اس کی روح میں۔ ناپنے اور تولنے کے سارے باٹ' سوچنے اور فیصلہ کرنے کے سارے پیمانوں کی طرح' ہم بالکل وہی استعمال کر رہے ہیں جو مغربی استعمار رخصت ہوتے وقت ہمارے ہاتھوں میں تھما گیا۔ جب ہم' ۱۹۴۷ سے آج تک' بائی دی لیفٹ کی جگہ بائی دی رائٹ سے اپنی فوجی مارچ شروع کرنے کا اہتمام نہ کر سکے' تو کسی بھی اہم شعبے میں کوئی بنیادی اور روحی تبدیلی کیسے لاتے۔ اب بہرحال یہ بھی ضروری ہے کہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کے نگران ایک ایک ہندسے اور نکتے پر صاد کریں' ممکن نہیں کہ کہیں انحراف ہو جائے۔ آقاؤں کے پیمانوں سے ہلکی سی جنبش کی گنجایش مشکل سے نکلتی ہے۔ وہی طے کرتے ہیں کہ خسارہ کتنا ہو' ڈیوٹیاں کتنی لگائیں' قرض کتنا لیں' آٹے دال کا' بجلی پانی کا بھاؤ کیا ہو۔

بال بال قرضوں میں بھی جکڑا جا چکا ہے۔ ہر پاکستانی ۱۲ ہزار روپے کا مقروض ہے۔ جتنی آمدنی ہوتی ہے وہ قرضے بمع سود ادا کرنے میں اور دفاعی اخراجات کے لیے بھی کافی نہیں۔ آمدنی ۲۵۹ ارب روپے متوقع ہے' قرضوں کی ادائیگی میں ۱۵۷ ارب جائیں گے' اور دفاع پر ۱۱۵ ارب لگیں گے' یعنی کل ۲۷۲ ارب' آمدنی سے ۱۳ ارب زیادہ۔ یہ ایسا ہے جیسے کسی کی آمدنی ۱۰۰ روپے ہو' وہ ۶۰ مہاجن کے

ہاتھ پر رکھ دے اور ۵۲ چوکیدار کو دے دے' اس کے بعد اپنی ساری ضروریات اور شوق قرض لے کر پورے کرے۔ چنانچہ اس سال ۱۱۰ روپے کے مزید قرضے لیے جائیں گے۔

بڑے بڑے اعداد و شمار سے عام آدمی کو کچھ حاصل نہیں۔ وہ تو یہ جانتا ہے کہ گرانی کا روز بروز بڑھنے والا بوجھ اس کی کمر توڑے دے رہا ہے۔ محترمہ وزیراعظم نے معیشت کی شاندار کارکردگی پر بڑی خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ کیا یہ خوشی اس بات کی ہے کہ ملک کے کارخانے اتنی بڑی تعداد میں بند ہیں (ایک اندازہ ۳ تا ۵ ہزار کا ہے) کہ اس سال واپڈا کو لوڈشیڈنگ کی ضرورت نہیں پڑی۔ یا اس بات پر کہ گرانی میں اضافہ کی شرح' جسے ۷ فی صد تک نیچے لانے کا وعدہ تھا' وہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۱۴ فی صد' اور صحیح غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۲۰ فی صد سے اوپر ہے۔ اس کمر توڑ بوجھ کا بار ہلکا کرنے کے لیے جو "زبردست" قدم اٹھایا گیا ہے وہ صرف مرکزی ملازمین کی تنخواہوں میں ۷ فی صد اضافہ ہے۔ کوئی پوچھے کہ باقی ۱۳ فی صد اضافے کا بوجھ ایک عام آدمی کیسے اٹھائے گا؟ اور اس ۷ فی صد اضافے کی حقیقت کیا ہے؟ گریڈ ۵ کے ایک ملازم کو ۵۲۲ کے مقابلے میں ۲۶.۶ روپے ملنے لگیں گے (۸۲ روپے کا شاندار اضافہ!)۔ اس کا بھی فوراً ازالہ کر دیا گیا ہے۔ پٹرول کی قیمت ۵ فی صد بڑھا دی گئی ہے' جس سے حکومت کو ۵ ارب کی آمدنی متوقع ہے۔ اس کے علاوہ' بجلی' پانی' گیس' کرائے بڑھانے کے لامحدود اختیار کارپوریشنوں کو دے دیے گئے ہیں۔ چنانچہ سال بھر منی بجٹ آتے رہیں گے۔ ایک اندازے کے مطابق زندگی گزارنے کے اخراجات میں اس سال ۳۰ فی صد کا اضافہ ہو گا۔

باقی اگر ہم بجٹ میں ایسے اقدامات تلاش کرنا چاہیں جن سے خسارہ اور قرض کم ہوں' گرانی کا بوجھ ہٹے' بے روزگاری میں کمی ہو' غربت کا ازالہ ہو' صحت کی سہولتیں فراہم ہوں' پینے کا صاف پانی ملے' تعلیم عام ہو' تو یہ تلاش بے سود ہے۔ ان اہداف سے سابق سوشلسٹ پیپلز پارٹی کے بجٹ کو کوئی سروکار نہیں۔ اور اگر کسی کو یہ توقع ہو کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ۴ کھرب سے زیادہ کے بجٹ میں ایک پائی بھی لوگوں کی اخلاقی ترقی کے لیے رکھی گئی ہو' تو اسے سخت مایوسی ہو گی۔

یہ بجٹ ہمارے معاشی افلاس ہی نہیں' ذہنی اور اخلاقی افلاس کا بھی آئینہ ہے۔

قائدین: کون اور کیسے؟

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حکمت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ آدمی خطبے کو مختصر کرے اور نماز کو طویل کرے۔ اس لیے اس وقت میں جو کچھ عرض کروں گا وہ ایک بہت مختصر تقریر ہو گی۔ میں صرف ان چند احادیث کی تشریح کروں گا جو اس معاملے میں صراحت کرتی ہیں کہ ہمیں اپنی قومی زندگی میں کن لوگوں کو آگے لانا چاہیے اور کس قسم کے لوگوں کو پیچھے رکھنا چاہیے۔

اب میں حضورؐ کے ارشادات عرض کرتا ہوں۔ پہلی جو چیز اس سلسلے میں ملتی ہے وہ یہ ہے:

سنت و بدعت کا فرق

جس نے کسی صاحب بدعت کی توقیر کی تو اس نے اسلام کو منہدم کرنے میں مدد کی۔

حدیث کو سمجھنے میں لوگوں کو اس لیے مشکل پیش آئی کہ گذشتہ چند صدیوں میں جو بحث مباحثے ہوتے رہے ہیں ان میں سنت و بدعت کا مفہوم محدود ہو گیا ہے۔ لوگ سمجھتے رہے ہیں کہ کچھ کھانے پینے کی ظاہری وضع قطع اور معاشرتی مسائل ہی میں سنت و بدعت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بیشک یہ سوال ان مسائل میں بھی پیدا ہوتا ہے لیکن اس کا پورا اور مکمل مفہوم یہ ہے کہ نبیؐ اور آپ کے صحابہ کا راستہ سنت کا راستہ ہے اور وہ زندگی کے سارے مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔ گھر کی' باہر کی' انفرادی' اجتماعی صلح اور جنگ' ہر وہ چیز جو اسلامی نظام زندگی سے مناسبت نہ رکھتی ہو' جو اسلام کے نظام میں باہر سے لا کر داخل کی جائے' خواہ وہ معاشرت سے تعلق رکھتی ہو یا سیاست سے یا کسی دوسرے شعبہ زندگی سے' وہ بدعت ہے۔

حضورؐ فرماتے ہیں کہ جو شخص اسلامی زندگی میں کوئی اجنبی شے لا کر داخل کر دے اس کی توقیر کرنے کے معنی اسلام کے انہدام میں مدد کرنا ہے۔ ایسے شخص کی جتنی توقیر کریں گے جتنے زیادہ ذرائع اس کے لیے مہیا کریں گے اتنی ہی گویا ہم اس کی مدد کریں گے کہ وہ اسلام کو منہدم کرے۔ اسی طرح جو شخص بیرونی فلسفوں اور اقدار اور خیالات کو اسلام میں ٹھونستا ہے وہ بھی دراصل اسلام کے نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایسے شخص کو احترام کا مقام دینا اسے سردار بنانا یہ مطلب رکھتا

ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ اسلام کا نظام درہم برہم کیا جائے - ایک صحیح قسم کی مسلم سوسائٹی کا مزاج یہ چاہتا ہے کہ اگر اس کے نظام میں کوئی شخص ایسی بات داخل کرنے کی کوشش کرے تو اس کے خلاف احتجاج ہونا چاہیے - ایسے لوگوں کو سوسائٹی میں کوئی عزت کا مقام نہ مل سکے -

فاسق

دوسری چیز جو حضور ؐ نے فرمائی یہ ہے:

جب فاسق کی تعریف کی جائے تو اللہ کو غصہ آتا ہے اور عرش لرز اٹھتا ہے -

آپ کے سامنے اگر آپ کے کسی مخالف کی تعریف کی جائے تو آپ پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے - اگر کوئی آپ کی توہین کرے اور کوئی دوسرا اس کی تعریف کرے تو آپ سمجھتے ہیں کہ یہ دوسرا بھی آپ کا ویسا ہی مخالف ہے - جو شخص کھلم کھلا خدا کے احکام کی خلاف ورزی کرے ' اللہ جس چیز کو حرام کہتا ہے وہ اس کو حلال کہے ' اور جو چیز حلال ہے اسے حرام قرار دے ' ہمارا ایسے لوگوں کی تعریف کرنا ' ان کے جلوس نکالنا ' ان کے لیے زندہ باد کے نعرے لگانا یہ واضح کرتا ہے کہ گویا ہمیں خدا سے ضد ہو گئی ہے - اس پر خدا کا غضب بھڑکنا ہی چاہیے - ہم اپنی سوسائٹی میں کھلے کھلے فاسقوں کی تعریف کرتے ہیں انھیں اپنا سردار بناتے ہیں - ایسی قوم کبھی پنپ نہیں سکتی -

منافق کی تعریف

کسی منافق کو نہ کہو کہ وہ سردار ہے -

منافق کی تعریف کیا ہے؟ ہر وہ شخص جس کی عملی اور اخلاقی زندگی شہادت دے کہ وہ اسلام کے بارے میں مخلص نہیں ہے - منافق ایمان سے خالی ہوتا ہے ' گناہ گار ایمان سے خالی نہیں ہوتا - ان میں فرق یہ ہے کہ آیا شخص مذکور اپنے گناہ پر نادم ہوتا ہے یا اس گناہ کے طریقے کو صحیح طرز عمل سمجھتا ہے اور اسے حکمت کا تقاضا گردانتا ہے -

ہمارے لیے یہ بالکل ناممکن ہے کہ جو لوگ گناہ کی ترویج کریں اور جو یہ کوشش کریں کہ اسلامی نہیں غیر اسلامی طریقے فروغ پائیں ' ہم ایسے لوگوں کو مومن و مخلص مان لیں - ایسے لوگوں کو اپنا سردار مان لینا یہ معنی رکھتا ہے کہ ہم نے اللہ سے جنگ مول لے لی -

منافق کی تعریف جو حضور ؐ نے فرمائی ہے ' یہ ہے: چار خصلتیں ہیں کہ جس کے اندر وہ پائی جائیں وہ خالص منافق ہے - ۱- جب اسے امین بنایا جائے تو خائن ثابت ہو - ۲- جب بولے تو جھوٹ بولے - ۳- جب عہد کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے - ۴- جب جھگڑے تو گالی دے -

۱۔ خیانت : جب اس پر بھروسہ کیا جائے تو وہ دھوکا دے۔ امانت کے مفہوم کو محدود معنی میں نہ لیجیے۔ انسان کے اندر کوئی خصلت ایسی نہیں پائی جاتی، جس کو سہارا دینے والی دوسری خصلتیں موجود نہ ہوں۔ اگر کسی کے اندر خیانت کا جذبہ پایا جاتا ہے تو اس کی معاون دوسری چیزیں بھی ہوں گی۔ پھر یہ کہ جو خدا کے معاملے میں خائن ہے اور اس کے ساتھ مخلص نہیں ہے تو کس طرح ممکن ہے کہ وہ بندوں کے معاملے میں امانت دار اور مخلص ہو۔

آدمی کا اندازہ اس کے ظاہر سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ اگر کسی سے خیانت کا اظہار ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کے اندر ایمان کی وہ بنیاد موجود نہیں ہے جو امانت کی جڑ کو قائم کرتی ہے۔

۲۔ جھوٹ : اتفاقاً جھوٹ بول دینا اور چیز ہے۔ لیکن یہ چیز کہ اپنی زندگی کے معاملات کو ہی جھوٹ سے چلایا جارہا ہے، ثابت کرتا ہے کہ اخلاق کی جڑوں کو جھوٹ کھا گیا ہے۔ جس شخص کی یہ حالت ہو اس پر یہ اعتماد نہیں کیا جاسکتا کہ وہ قومی معاملات میں جھوٹ نہیں بولے گا اور قوم کو دھوکا نہ دے گا۔

۳۔ بدعہدی : اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جب دیکھے کہ عہد توڑنے سے اسے فائدہ پہنچ سکتا ہے تو وہ اسے توڑ دے۔ واضح رہے کہ ایمان بھی خدا سے ایک عہد ہے۔

۴۔ فجور جب کسی سے اس کا جھگڑا ہو جائے تو وہ اسے نقصان پہنچانے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقے اختیار کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ ایسے شخص سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے سر کو خدا کے آگے جھکا سکے گا۔ وہ تو اپنی باگیں اپنے نفس کے ہاتھ میں دے چکا ہے۔

اس امت کے معاملے میں سب سے بڑھ کر جس چیز کا اندیشہ ہے وہ ایسے ہی منافق کا اندیشہ ہے جو باتیں تو بڑی حکمت کی کرے، لیکن عمل اس کے خلاف ہو۔ یعنی آپ جب ان کی باتیں سنیں تو دل خوش ہو جائے لیکن ان کا عمل اس کے برعکس ہو۔ ایسے لوگ سوسائٹی کے اندر گھن کا حکم رکھتے ہیں۔

(جامع مسجد پی آئی بی کالونی کراچی میں خطبہ جمعہ : جولائی ۱۹۵۰)

معاویہ بن حیدہ ؓ سے روایت ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

پڑوسی کا حق ہے:

- اگر وہ بیمار ہو جائے تو تم اس کی عیادت کرو۔
- اگر انتقال پا جائے تو جنازے میں ساتھ جاؤ۔
- اگر تم سے قرض مانگے تو اسے قرض دو۔
- اگر کوئی بُرا کام کرے تو اس کی پردہ پوشی کرو۔
- اگر اسے کوئی خیر پہنچے تو اسے مبارکباد دو۔
- اگر اسے کوئی رنج پہنچے تو تعزیت کرو۔
- اپنے مکان کو اس کے مکان سے اتنا بلند نہ کرو کہ اس کے لیے ہوا بند ہو جائے۔
- اور تمھاری ہانڈی کی مہک سے اسے تکلیف نہ پہنچے اِلّا یہ کہ اس میں سے تھوڑا سا اس کے لیے بھی بھیج دو۔

(معجم کبیر طبرانی)

معاملات میں ظلم

سید قطب

آغاز کم ناپ تول کرنے والوں کے خلاف اللہ کے اعلان جنگ سے ہوتا ہے۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ’ہلاکت ہے (ہو) کم ناپ تول کرنے والوں کے لیے۔ (المطففین ۸۳:۱)

ویل کے معنی ہیں ہلاکت۔ آیت کا مفہوم خواہ یہ ہو کہ ان کی ہلاکت و بربادی ایک طے شدہ امر ہے جو ہو کر رہے گا یا ان کے لیے ہلاکت کی بددعا ہو‘ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہے‘ کیونکہ خدا کی جانب سے دعا کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیز ہو کر رہے گی۔

اگلی دو آیات سے مطففین کے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے:

الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ، وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ - (۲-۳)

جو لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو بھرپور لیتے ہیں‘ اور انھیں ناپ یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔

یعنی خریدار ہوں تو چیزوں کو بھرپور لینے کا اہتمام کرتے ہیں‘ مگر بائع ہوں تو کم دیتے ہیں۔

بعد کی تین آیات میں ان لوگوں پر حیرت کا اظہار کیا گیا ہے‘ یہ لوگ معاملات کو اس طرح انجام دے رہے ہیں گویا دنیا میں وہ جو کچھ کر رہے ہیں‘ اس کے سلسلے میں کوئی حساب نہ ہوگا۔

اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ، لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ، يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ - (۴-۵-۶)

کیا انھیں یہ خیال نہیں آتا کہ انھیں اٹھایا جائے گا اس عظیم دن‘ جب کہ لوگ رب العالمین کے حضور (جواب دہی کے لیے) کھڑے ہوں گے۔

مکی سورتوں میں عموماً بنیادی عقائد پر بحث کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ اخلاقی حس کو عمومی طور پر پیدا کرنے‘ اور بنیادی عقیدہ سے اسے متعلق کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لیے ایک مکی سورت میں ناپ تول کے مسئلے پر خصوصی توجہ پر غوروفکر کے بعد بہت سے اہم امور سامنے آتے ہیں۔

پہلی بات یہ کہ مکہ کے سماج میں اسلام کو ناپ تول کی کمی کی ایک تشویش ناک صورت حال کا

سامنا تھا۔اس مرض میں مکہ کے "بڑے" مبتلا تھے' جو اس زمانے میں وسیع پیمانے پر تجارت کرتے تھے اور اس تجارت نے ذخیرہ اندوزی و اجارہ داری کی شکل اختیار کر لی تھی۔ان "بڑوں" کے ہاتھ میں بہت زیادہ دولت تھی۔یہ جاڑے اور گرمی کے موسم میں یمن اور شام کے تجارتی سفروں پر قافلوں کی صورت میں جاتے۔اس کے علاوہ انھوں نے وقتی اور موسمی بازاروں کا نظم بھی کیا تھا' مثلاً حج کے زمانے میں عکاظ کا بازار لگتا۔

آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ناپ تول میں کمی کرنے والے -- جنھیں اللہ تعالیٰ تباہی و بربادی کی دھمکی دے رہا ہے اور جن کے خلاف اعلان جنگ کر رہا ہے ---"بڑوں" کے طبقے سے تعلق رکھنے والے بااثر و بااقتدار لوگ تھے۔وہ لوگوں کو اپنی خواہشات کے آگے مجبور کرنے کی طاقت رکھتے تھے۔ عن الناس کے بجائے عَلَی النَّاسِ کے الفاظ ہیں: علی میں جبر کا مفہوم ہے۔مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے اپنا پورا حق لے لیتے تھے' کیونکہ یہ کوئی جرم نہیں ہے جس کے خلاف اعلان جنگ صحیح ہو۔مطلب یہ ہے کہ طاقت کے بل پر وہ اپنے حق سے زیادہ حاصل کرتے' اور جو کچھ چاہتے لوگوں سے جبراً کر لیتے۔مگر جب انھیں ناپ یا تول کر دیتے تو اپنی طاقت کے زور سے انھیں کم دیتے اور ان کا حق مار لیتے۔عامتہ الناس میں یہ سکت نہ تھی کہ وہ ان سے انصاف یا اپنا حق حاصل کر سکتے۔"بڑے" یہ دھاندلی حکومت کی طاقت' قبیلے کی قوت اور دولت کے بل بوتے پر کرتے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لوگ ان کی چیزوں اور ان کے مال و دولت کے ضرورت مند تھے۔یہی نہیں' ان کی ذخیرہ اندوزی اور اجارہ داری کے باعث لوگ اس ظلم کو انگیز کرنے پر مجبور تھے' جیسا کہ ابھی تک بازاروں میں ہوتا ہے۔

مکہ کے ان حالات کی طرف اسلام کی اس اولین توجہ سے اس کا مزاج واضح ہوتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظام' انسان کی واقعاتی زندگی اور اس کے تمام عملی حالات پر حاوی ہے' اور انسانی زندگی کو اخلاقی اقدار کی محکم اور عمیق بنیادوں پر قائم کرنا دین قیم کی عین فطرت ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلام کو ظلم اور معاملات میں اخلاق سے انحراف کی یہ رَوش گوارا نہ ہو سکی' حالانکہ اجتماعی زندگی کی زمام ابھی اس کے ہاتھ میں نہ آئی تھی کہ وہ قانون اور حکومت کے بل پر شریعتِ الٰہی کے مطابق اجتماعی زندگی کی تشکیل کرنے کی پوزیشن میں ہوتا۔اس کے باوجود اسلام نے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے خلاف یہ بانگِ دہل اعلانِ جنگ کر دیا اور انھیں تباہی و بربادی کی دھمکی دی' جبکہ اس جرم کا ارتکاب کرنے والے معمولی لوگ نہیں' مکہ کے سردار اور رسوخ و اقتدار کے مالک لوگ تھے۔وہ بت پرستی کے عقیدے کے واسطے سے عوام کے ذہنوں اور روحوں پر تو اثر و اقتدار رکھتے ہی تھے' ان کی اقتصادیات

اور ان کی معاش کے مختلف پہلوؤں پر بھی ان کا تسلط تھا۔ اسلام نے عامتہ الناس کی اس معاشی لوٹ کھسوٹ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اس صدائے احتجاج کے ذریعے ' جو اس کی ذات اور اس کے آسمانی طرز زندگی سے ابھر کر بلند ہوئی ' استحصال کے مارے فریب خوردہ عوام کو ہوشیار و بیدار کیا۔ اس نے عوام کو سلانے کا کام کبھی نہیں کیا ' اس وقت بھی نہیں جب وہ مکہ میں مجبور و محصور تھے اور مکہ کے ظالم و جابر سرداروں کی طاقت کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔

قریش کے اکابر نے دعوتِ اسلامی کے خلاف جو شدید معاندانہ موقف اختیار کر رکھا تھا ' اس کے حقیقی اسباب کا کچھ اندازہ اسلام کے اس رویے سے ہوتا ہے۔ قریش کے اکابر کو بلا ریب و شک اس بات کا بخوبی احساس و ادراک تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس نئے دین کو لے کر آئے ہیں ' وہ مجرد ایک قلبی عقیدہ نہیں ہے جو صرف لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی شہادت اور بتوں کے بجائے خدا کے لیے اقامت صلوٰۃ کا طالب ہو۔ نہیں ' نہیں! وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ یہ عقیدہ ایک طرز زندگی سے عبارت ہے ' جو جاہلیت کی ہر بنیاد کو ' جس پر اس کے طور و طریق ' مفادات و مصالح اور مراکز قائم ہیں ' ڈھا دے گا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس دین کی فطرت دوئی کی روادار نہیں ہے ' اور وہ کسی زمینی عنصر سے ' جو اسلام کے آسمانی عناصر سے پیدا اور پھوٹا نہ ہو ' مصالحت کے لیے تیار نہیں ہے۔ نیز وہ تمام پست زمینی اقتدار کے لیے ' جن پر جاہلیت قائم ہے ' شدید خطرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے دین اسلام کے خلاف وہ جنگ چھیڑی ' جو نہ ہجرت سے قبل ختم ہوئی اور نہ اس کے بعد۔

آج بھی اسلام کے غلبے کے خلاف جو لوگ جنگ چھیڑے ہوئے ہیں ' خواہ ان کا تعلق کسی بھی قوم اور کسی بھی سرزمین سے ہو ' اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلام ان کے تمام باطل طور و طریق اور غاصبانہ مفادات کے لیے شدید خطرہ ہے۔ ظالم و جابر اور متکبر و سرکش لوگ ' جو مطفف (ڈنڈی مارنے والے) ہیں۔ -- خواہ مال و اسباب میں بددیانتی کے مرتکب ہوتے ہوں یا دوسرے حقوق و فرائض میں -- وہ دوسروں سے زیادہ اس پاکیزہ و عادلانہ نظام کے غلبے سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ نظام کسی اور نظام سے مول تول کا قائل ہے اور نہ مداہنت کا روادار۔

اوس اور خزرج کے زعمانے جب کالے گورے ' تمام انسانوں سے جنگ کرنے کے لیے رسول اللہ ؐ کے ہاتھ پر بیعت کی ' تو انھوں نے بھی اس دین کے مزاج کو سمجھ لیا تھا ' جیسا کہ اس سے قبل قریش کے اکابر اس تک پہنچ گئے تھے ' یہ حقیقت ان کی سمجھ میں اچھی طرح آگئی تھی کہ یہ دین تلوار کی دھار کی طرح عدل و انصاف پر قائم ہے اور انسانوں کی زندگی کو عدل و انصاف پر قائم کرنے کے لیے اترا ہے۔

وہ کسی ظالم کے ظلم، کسی سرکش کی سرکشی، اور کسی متکبر کے تکبر کو انگیز کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، نہ انسانوں کی لوٹ کھسوٹ اور استحصال کو برداشت کرنے کے لیے آمادہ۔

مگر ان مطففین کا معاملہ عجیب ہے! اس بات کا مجرد گمان ---- یقین نہیں، گمان ---- کہ ایک عظیم دن آئے گا جب کہ سب انسانوں کو دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا، جب کہ لوگ ہر طرف سے کٹ کر رب العالمین کے حضور کھڑے ہوں گے، اس دن اس کے سوا ان کا کوئی مولیٰ اور کارساز نہ ہو گا، ان کے سامنے ایک ہی راہ ہوگی اور وہ یہ کہ خدا ان کے سلسلے میں جو بھی فیصلہ کرے اس کا انتظار اور سامنا کریں۔ اس بات کے لیے کافی تھا کہ وہ ناپ تول میں کمی کرنے، لوگوں کا مال ناحق کھانے اور اپنی قوت و اقتدار کے بل پر لوگوں پر ظلم اور معاملات میں ان کی حق تلفی کرنے سے باز رہتے۔ لیکن وہ ہیں کہ ناپ تول میں بددیانتی کے راستے پر چلے جا رہے ہیں۔ انھیں خیال و گمان بھی نہیں ہوتا کہ انھیں دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ کس قدر عجیب و غریب ہے ان کی حالت! (فی ظلال القرآن، ترجمہ: سید حامد علی، تدوین: خرم مراد)

مذاکرہ

دینی مدارس کا نظامِ تعلیم

مرتبہ: خرم مراد

نئی صلیبی جنگ ، دینی مدارس کے دروازوں پر (مئی ۹۵) میں ہم نے مدارس کے خلاف حکومت پاکستان اور مغربی حکومتوں کی مہم اور اس کے اسباب کا مختصر جائزہ پیش کیا تھا۔ ملت کی طرح مدارس بھی بظاہر اس معرکہ آرائی کے لیے تیار نظر نہیں آتے۔ ہر درد مند صاحبِ نظر جانتا ہے کہ دونوں ایک زبردست قوتِ اجتہاد و جہاد کے ذریعے اصلاح تغیر و تبدل اور تعمیرِ نو کر کے ہی اس معرکے میں کامیابی کی توقع کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے 'مدارس میں تغیر و اصلاح' کے موضوع پر ہم قدیم و جدید علما و مفکرین کے افکار کو ایک مذاکرے کی صورت میں مرتب کر کے قارئین کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ یہ اعتراف ضروری ہے کہ مختصر سے صفحات میں ایک مذاکرہ جامع نہیں ہو سکتا' اور یہ بھی کہ اس مذاکرے میں بیش تر بحث کا محور نصابِ تعلیم ہے' جبکہ نظامِ تعلیم کے دوسرے پہلو بھی اہم ہیں۔ (مدیر)

۱ - مولانا قاسم نانوتوی: ترجمانی 'سید مناظر احسن گیلانی' سوانح قاسمی، ج ۲

حد سے زیادہ تاریک اور مہیب مستقبل کا' جس سے اچانک سرزمینِ ہند میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دوچار ہو گئی تھی' مقابلہ کرنے کے لیے جو میدان میں اترا تھا' وہ جو کچھ ہو سکا کر گزرا۔ یوں اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک مستقل دینی و علمی تحریک کی بنیاد پڑ گئی۔ اپنے بانی کے نام کی نسبت سے اس کی تعبیر چاہیے کہ "قاسمیت" کے نام سے کی جائے۔

دینی تعلیم کا مستقل نظام' اس تحریک کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ہے' جس کی بنیاد دارالعلوم دیوبند پر قائم ہے۔ مگر جس تعلیمی نظام سے مغرب نے دنیا کو روشناس کرایا ہے' اس میں سے جماعت بندی' امتحان' خصوصاً تحریری امتحان' طلبہ کی حاضری کے رجسٹر اور از قبیل دوسرے لوازم و خواص کے ایک بڑے حصے کو اس دارالعلوم میں نہ صرف قبول کر لیا گیا ہے بلکہ پوری قوت و احتیاط کے ساتھ

تعلیم کی ان جدید خصوصیات کی نگرانی بھی کی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ دیوبند میں عصری یونی ورسٹیوں کی خصوصیات کے شریک ہونے کے اسباب کیا ہوئے؟ کیونکہ مسلمانوں میں تعلیم کا جو طریقہ مروج تھا' اس میں ہم ان جدید خصوصیتوں کو نہیں پاتے' افادیت اور عدم افادیت کی بحث جداگانہ ہے۔

[جہاں تک میرا خیال ہے] 'ہندستان کی نئی حکومت نے جو عربک کالج دلی میں قائم کیا' اس کے صدر مولانا مملوک العلی سے بانی دارالعلوم نے تعلیم حاصل کی تھی۔ چنانچہ مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی' اور ان کو دینی زندگی سے منحرف کرنے کی کوششوں کے مقابلے کے لیے دینی علوم کی عمومیت کے لیے کیا کرنا چاہیے' اور نئے حالات کی رو سے تعلیم و تدریس کے نظام میں کن اصلاحات کی ضرورت ہے' ان مسائل کے حل کے لیے دلی عربک کالج کے ماحول میں "نظریات" کو "عملی قالب" میں دیکھنے کے مواقع آپ کو ملے۔ ایسی صورت میں 'کوئی وجہ نہ تھی کہ اجتماعی درس و تدریس کے جس طریقے کا آپ مشاہدہ فرما رہے تھے' اس سے استفادے کی تدبیریں آپ کے دماغ میں نہ آئی ہوں۔

حضرت نے بطور وصیت نامے کے ان بنیادی اصولوں کو قلم بند فرمایا جن پر آپ نے اس دارالعلوم کی بنیاد قائم فرمائی تھی' اور وصیت فرمائی کہ آیندہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں دارالعلوم کے نظم و نسق کی باگ آئے' وہ ان اصولوں کی روح کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔

اسی تحریر خاص میں ایک دفعہ ان الفاظ میں بھی ہے کہ "دارالعلوم کا تعلق عام مسلمانوں سے زائد سے زائد ہو' تاکہ یہ تعلق خود بخود مسلمانوں میں ایک نظم پیدا کرے' جو ان کو اسلام اور مسلمانوں کی اصل شکل پر قائم رکھنے میں معین ہو"۔ گویا دارالعلوم کا مسلمانوں سے "جمہوری تعلق ہو' جو ایک کو دوسرے کا محتاج بنائے رکھے"۔ اسی بنیاد پر آپ آمدنی کے کسی مستقل ذریعے کے قائم کرنے کے خلاف تھے کہ 'حکومت یا کسی رئیس کی دوامی امداد' یا مستقل جائداد' کی صورت میں عام مسلمانوں سے احتیاجی رشتہ دارالعلوم کا باقی نہ رہے گا۔

اسی طرح' دینی زندگی کی حفاظت کے لیے اس جدید تعلیمی نظام میں 'حضرت کے نزدیک' ہمارے قدیم علما کی تدریس و تعلیم کا انفرادی طریقہ قطعاً ناکافی تھا' اور مشاہدے سے اس کی تصدیق بھی ہو رہی تھی۔ فرمایا کہ 'کیفیت میں ترقی تو اسی طریقے سے ہوتی ہے' لیکن علم کی وسعت اور علما کی تعداد بڑھانے کی واحد صورت یہی ہے کہ درس و تعلیم کے اجتماعی طریقے کو اختیار کیا جائے۔ اس لیے آپ ایسا نظام قائم کرنا چاہتے تھے جس میں حتی الوسع تعلیم کے عصری لوازم اور تقاضوں کو بھی سمونے کی صورت نکالی جائے۔

جس زمانے میں [آپ ان نظریات کے لیے جگہ ڈھونڈ رہے تھے]' آپ اندازہ ہی نہیں کر سکتے

کہ ہمارے قدیم علما کے لیے ان چیزوں ہی کی نہیں بلکہ ان کے تصور کی بھی کیا نوعیت تھی۔ ان مولویوں کے نزدیک علم کی کیفیت کا مسئلہ تھا' جبکہ آپ کے لیے کیفیت سے زیادہ کمیت اور مقدار کا مسئلہ اہم تھا۔

نظام تعلیم میں سب سے پہلا مسئلہ نصاب تعلیم کا ہے۔ جو کچھ پڑھایا پڑھایا جاتا ہے اس کو دیکھ کر عام رائے یہی قائم ہو سکتی ہے کہ دارالعلوم کی تاریخ میں نصاب تعلیم کے مسئلے پر شاید کبھی غور نہیں کیا گیا' من و عن درس نظامیہ کا نصاب قبول کر لیا گیا' اور زمانے کے جدید تقاضوں کی طرف سے چشم پوشی اختیار کی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ جو دیکھا جا رہا ہے اس کو دیکھ کر کہنے والے آخر اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ لیکن حضرت کا نقطہ نظر اس باب میں کیا تھا؟ اس کو پیش کرنے سے پہلے چاہیے کہ ایک بات سمجھ لی جائے۔

تعلیمی نصاب کے متعلق سب سے زیادہ اہم سوال یہی ہے کہ یورپ کے جن جدید علوم و فنون اور زبانوں سے آگاہی حاصل کیے بغیر عصر حاضر میں امتیاز و وقار حاصل نہیں کیا جا سکتا' ان کا پیوند دینی علوم سے کیسے قائم کیا جائے۔

اب تو علما کی اکثریت اس سوال کی اہمیت کو محسوس کرنے لگی ہے' لیکن اس مسئلے کا حل پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا دینی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کی کتابیں بھی نصاب میں شریک کرنی چاہئیں؟ یا جدید علوم و فنون سے فارغ ہونے کے بعد اسلامی علوم کے سیکھنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ ایک تیسرا احتمال بھی ہے۔ یعنی پہلے مسلمان بچوں کو دینی علوم سے کم از کم وقت میں قدر ضرورت کی حد تک واقف بنا لینے کے بعد ان کو جدید علوم و فنون کی یونی ورسٹیوں میں شریک کیا جائے۔

اب دیکھیے کہ حضرت کا زاویہ نگاہ اس باب میں کیا تھا:

فارغ طلبہ کو سند و انعام دینے کے لیے ۹ جنوری ۱۸۷۴ کو ایک جلسہ دیوبند میں منعقد ہوا تھا۔ "کانووکیشن" طرز کا یہ جلسہ تھا۔ ایک خصوصیت اس جلسے کی یہ بھی نظر آئی کہ فارغ ہونے والے طلبہ سے علم کے کسی خاص موضوع پر امتحانی مقالے لکھوائے گئے تھے۔ یعنی یونی ورسٹیوں کے آخری مدارج میں جیسے مقالے لکھوائے جاتے ہیں' دارالعلوم میں تقریباً ایک صدی پہلے یہ سنت جاری ہو چکی تھی' جو افسوس ہے کہ بعد کو جاری نہ رہی۔

اسی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا: "اب ہم اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے کہ درباب تحصیل' یہ طریقہ خاص کیوں تجویز کیا گیا۔ یعنی 'علوم جدیدہ کو کیوں نہ شامل کیا گیا۔ منجملہ دیگر اسباب کے' بڑا سبب اس بات کا تو یہ ہے کہ تربیت عام ہو' یا خاص' اس پہلو کا لحاظ چاہیے جس کی طرف سے ان کے کمال میں رخنہ پڑا ہو۔ سو اہل عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم

علومِ جدیدہ تو بوجہ کثرتِ مدارسِ سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علوم قدیمہ کو سلاطینِ زمانہ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی۔ہاں 'علومِ نقلیہ (یعنی خالص دینی و اسلامی علوم) کا یہ تنزل ہوا کہ ایسا تنزل بھی کسی کارخانے میں نہ ہوا ہوگا۔ایسے وقت میں رعایا کو مدارسِ علوم جدیدہ کا بنانا تحصیلِ حاصل نظر آیا۔ لہٰذا صرف بجانب علومِ نقلی (یعنی خالص اسلامی و دینی علوم)' اور نیز ان علوم کی طرف جن سے استعداد علوم مروجہ اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے' (انعطاف) ضروری سمجھا گیا"۔

یعنی' مسلمان جس علم سے محروم رہ جانے کے بعد مسلمان باقی نہیں رہ سکتے' اور نئی حکومت جن علوم کی سرپرستی سے صرف دست بردار ہی نہیں ہوگئی بلکہ اس کے پیدا کیے ہوئے ماحول میں وہ زبونی کے آخری حدود تک پہنچ چکے ہیں' ان علوم کے احیا و بقا کا انتظام رعایا کی مالی امداد سے کیا جائے۔

خصوصی توجہ کا مستحق توجیہ کا دوسرا پہلو ہے۔فرمایا کہ اس طرح "استعدادِ علومِ جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے"۔یعنی' مروجہ نصاب کو پڑھ کر فارغ ہونے والوں میں علوم جدیدہ کے حاصل کرنے کی بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔گویا علومِ جدیدہ کی تعلیم کا مقدمہ بھی دینی تعلیم کا نصاب بن سکتا ہے۔آگے نصاب میں علومِ نقلیہ اور علومِ دانش مندی کو داخل کرنے کا ذکر کرتے ہوئے' اپنے صحیح تعلیمی نصب العین کو حضرت نے واضح فرما دیا ہے: "اس کے بعد اگر طلبہ مدرسہ ہذا مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ مُوید ثابت ہوگی"۔

غم و غصہ اور دل افگاری کے ان ایام میں' جب مسلمانوں کو ہندستان جیسی اقلیم کی شہنشاہیت سے محروم کر کے غلام بنا لیا گیا تھا' ان کے قلوب میں قدرتاً اس قوم کی طرف سے انتقام اور نفرت کی آگ بھری ہوئی تھی جس کے ہاتھوں اس سیاہ انجام تک وہ پہنچے تھے' ہر وہ چیز جو اس قوم کی طرف منسوب تھی فطرتاً اس سے مسلمان بھڑکتے تھے' انگریزی مدارس میں جو کچھ پڑھایا جاتا تھا اس کے تصور سے بھی وہ لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔اسی ماحول میں حضرت یہی نہیں کہ انگریزی مدارس میں داخل ہو کر تعلیم پانے کے جواز کا فتویٰ دے رہے ہیں' بلکہ بغیر کسی جھجک کے مولویوں کی بھری ہوئی مجلس میں اعلان فرما رہے ہیں کہ سرکاری مدارس میں شریک ہو کر علوم جدیدہ کی تعلیم' علمی کمالات کے چمکانے اور آگے بڑھانے میں مولویوں کے لیے مُفید ثابت ہوگی۔

اللہ اللہ' ایک طرف اسی زمانہ میں مولویوں کی اکثریت یہ باور کیے بیٹھی تھی کہ جو کچھ انھوں نے پڑھ لیا ہے' اس کے سوا کوئی دوسری چیز ایسی نہیں ہے جسے سیکھا اور پڑھا جائے۔دوسری طرف' ان ہی مولویوں کے درمیان' پکارنے والا پکار رہا ہے کہ مولویوں میں جو اپنے علمی کمالات میں مزید فروغ اور زیادہ وزن پیدا کرنا چاہتا ہے' چاہیے کہ یورپ کے جدید علوم کا مطالعہ کرے اور ان کی علمی

زبانوں کو سیکھے۔ یقیناً حضرت والا کے ارشاد گرامی کا یہی مطلب ہے۔ یورپ کے جدید علوم و فنون کی اہمیت و ضرورت کا انکار اس زمانے میں عموماً ہمارے علما نے اپنا پیشہ بنا رکھا تھا۔ مگر دیوبندی نظام تعلیم کے امام اول و اکبر نے ٹھیک وقت پر ان جدید عصری علوم کی ضرورت و اہمیت کو تسلیم کر لیا تھا۔ بلکہ حضرت کے الفاظ سے آگاہ ہونے کے بعد بلا خوف تردید یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنا تعلیمی نظریہ یہی پیش کیا ہے 'کہ پہلے دینی و اسلامی علوم کا نصاب' دانش مندی کے فنون کے ساتھ ختم کرا لیا جائے' اس کے بعد علوم جدیدہ کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے سرکاری مدارس میں مسلمان بچوں کو داخل کیا جائے۔

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نے اپنے ہی زمانے میں تعلیم کے تمام پہلوؤں اور ان کے مختلف نتائج کا صحیح اندازہ کر لیا تھا۔ حکومت مسلّطہ کی امداد کی طرف غلطی سے بھی آپ دیکھنا شاید پسند نہیں فرماتے تھے' لیکن قدیم و جدید علوم کے پیوند کی مجوزہ ترتیب کی افادیت کے خیال نے اس حد کے توڑنے پر بھی آپ کو شاید مضطر و مجبور کر دیا تھا۔ سب سے بڑی رکاوٹ آپ کی تجویز کے عملی نفاذ میں میٹرک کے امتحان کے لیے عمر کی قید تھی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ نے حکومت کو پکارا ہے: "کاش گورنمنٹ ہند بھی قید عمر طلبہ تو داخل کو اڑا دے"۔

شروع میں مدرسے کی تعلیمی مدت دس سال مقرر کی گئی تھی۔ لیکن دو سال گزرنے کے بعد حساب اور تعلیمی مدت وغیرہ پر نظر ثانی کرنے کے لیے ایک مجلس مقرر کی گئی۔ اس نے یہ ایک تجویز پیش کی کہ تمام کتب کے لیے چھ سال کی مدت مقرر کی جائے۔ یعنی حدیث و تفسیر و فقہ و اصول فقہ و فرائض کی وہ ساری کتابیں ختم ہو جائیں جن کے پڑھنے پڑھانے کا عام رواج اس زمانے میں تھا۔ دس سال کی عمر میں اس شش سالہ نصاب کو شروع کر کے سولھویں سال میں پڑھنے والے اس کو ختم کر سکتے تھے اور جدید علوم اور نئی علمی زبانوں کو سیکھ کر بائیس تیئس سال کی عمر میں گریجویٹ بن جانے کا کافی موقع پیدا کر دیا گیا تھا۔ یعنی حضرت کی مجوزہ ترتیب کے مطابق باضابطہ مولوی اور مستند گریجویٹ بن جانے کا وقوعی امکان مسلمانوں کے سامنے آ گیا تھا۔

صحیح طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ اس تعلیمی نصب العین کے مطابق آیندہ عمل درآمد کی راہوں میں کیا رکاوٹیں پیش آئیں کہ اس قیمتی امکان سے مستفید ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ پچاس سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر کی اجل مُسمّی پوری ہو گئی۔ اور میرا خیال تو یہی ہے کہ آپ کے تعلیمی نصب العین کے عملی نفاذ میں غالباً آپ کی وفات کا واقعہ زیادہ اثر انداز ہوا۔ ہر شخص کے بس کی بات یہ نہ تھی کہ جس زمانے میں مدرسہ قائم ہوا تھا' اور جو ماحول اس عہد کا تھا' اس میں اس تعلیمی

نصب العین اور اس کے ثمرات و فوائد کا صحیح اندازہ لگا سکتا۔ روداد میں درج ہونے کے باوجود آپ کے اس تعلیمی نصب العین کا چرچا لوگوں میں بعد کو نہیں کیا گیا' حتیٰ کہ اس کا خیال بھی لوگوں میں باقی نہ رہا۔ سوچنے والے کی بات شاید سوچنے والے کے ساتھ ہی دفن ہو گئی۔

گو واضح اور صریح شہادت تو میرے پاس نہیں ہے' لیکن جو تبدیلیاں آئے دن اس شش سالہ نصاب میں ہوتی رہیں' ان کو دیکھ کر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس نصاب کو درس نظامیہ والے مولویوں نے اس لیے قبول نہیں کیا کہ ایک کے سوا فلسفے کی کوئی کتاب اس نصاب میں نہیں رکھی گئی تھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دارالعلوم کے نصاب میں درس نظامیہ کی ایک ایک معقولی کتاب اپنے تمام حواشی کے ساتھ بہ تدریج شریک ہوتی چلی گئی' جن کو خارج کر کے نصاب کو محدود مدت میں ختم کرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ فارسی ادب کی کتابوں کا اضافہ کر کے' ملک کے قدیم تعلیم یافتہ طبقہ کی تسکین کا کام لیا گیا۔ ادب عربی کی نظم و نثر کو داخل کر کے جدید تعلیم یافتوں کے اس مطالبے کی تکمیل کی گئی تھی کہ عربی پڑھنے والے مولوی بھی عربی میں بول کر اور لکھ کر ہم کو دکھائیں۔ بہرحال اسی سہ عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دارالعلوم کا تعلیمی نصاب کافی بوجھل اور عریض و طویل ہوتا چلا گیا۔ اسی نصاب کے ختم کرنے میں پڑھنے والوں کی عمر کا کافی حصہ صرف ہونے لگا۔ ظاہر ہے کہ لمبی لمبی داڑھیوں کے ساتھ سرکاری مدارس میں داخل ہو کر پڑھنے کی صورت ہی کیا تھی؟ اور یوں حضرت کا تعلیمی نصب العین صرف ایک تاریخی نصب العین بن کر رہ گیا۔ آخر اگر یہ نہ مانا جائے' تو پھر اس واقعہ کی کیا توجیہ کی جائے کہ یہ سب تبدیلیاں ہوتی رہیں' اور کسی طرف سے کوئی مخالفانہ آواز مجلس شوریٰ میں نہیں اٹھائی گئی۔

بہت زیادہ طول کلامی سے مجھے کام لینا پڑا' لیکن کرتا کیا؟ حضرت کا صحیح تعلیمی نصب العین نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جب یہی چاہا گیا تھا کہ دینی تعلیم کے بعد جدید علوم اور نئی علمی زبانوں سے استفادہ کا موقع مسلمان بچوں کے لیے فراہم کیا جائے' تو پھر ایسا کیوں نہ ہوا؟ اور تقریباً ایک صدی کی طویل تاریخ میں کوئی ایک "نمونہ" بھی اس تعلیمی نصب العین کے مطابق دیوبند کا دارالعلوم کیوں پیش نہ کر سکا؟ قدیم و جدید علوم و السنہ کے پیوند کی جو مہم آپ سر کرنا چاہتے تھے' افسوس ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا نظام تعلیم اس وقت تک اس کے سر کرنے میں ناکام رہا ہے۔

ہمارے درس نظامیہ کے تدریسی حلقوں میں فلسفے کے نام سے جو کچھ پڑھایا جاتا تھا' وہ اس زمانے میں قطعی طور پر مردہ ہو چکا تھا۔ لیکن ہمارے علما محض موروثی روایات کے زیر اثر اسی مرحوم و مدفون فلسفے کی کتابیں پڑھاتے چلے جا رہے تھے۔ آپ ہی بتایئے کہ طلبہ کا قیمتی وقت اور عمر کا گراں مایہ حصہ ایک ایسے مہمل مشغلے میں جو برباد ہو رہا تھا' اس پر سنجیدہ دماغوں کو جتنا بھی غصہ آئے کم تھا۔ فلسفے کی

ضرورت مغرب کا جدید فلسفہ ہی پوری کر سکتا تھا' لیکن اس کی طرف نظامی درس کے معقولی علما نگاہ غلط انداز بھی ڈالنا پسند نہیں کرتے تھے۔ حضرت قدیم علوم کا جدید علوم سے جو رشتہ قائم کرنا چاہتے تھے' یہ رشتہ اگر قائم ہو جاتا' تو بجائے اس مردہ فلسفے کے یورپ کے جدید فلسفے کے مطالعے کا موقع ہمارے علما کے لیے بآسانی میسر آسکتا تھا۔

۲۔ سید مناظر احسن گیلانی: مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ج ۲

سالہا سال کے غور و فکر اور مختلف تعلیمی نظاموں کے تجربے کے بعد نصاب تعلیم اور مسلمانوں کی تعلیمی مشکلات کے مسئلے میں جس نتیجے تک پہنچا ہوں' وہ میری کتاب نظام تعلیم و تربیت میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

آج تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک کا نام دینی علوم' اور دوسرے کا نام دنیاوی علوم رکھا گیا ہے۔ دونوں کی تعلیم گاہیں الگ الگ ہیں' دونوں کا نصاب تعلیم جدا جدا۔ ایک طرف یونی ورسٹیاں اور کالج' اور ان کے "تعلیم یافتہ" حضرات ہیں' اور دوسری طرف دینی مدارس اور ان کے "علما اور مولوی" ہیں۔ علم کا دعویٰ دونوں کو ہے' دونوں مسلمانوں کی راہ نمائی کے دعوے دار بھی ہیں۔ عوام ان کے ہاتھوں میں فٹ بال کی گیند بنے ہوئے ہیں۔ مولوی جب ان کے پاس آتے ہیں تو تعلیم یافتوں کی مغرب زدگیوں' دینی بے باکیوں' غلامانہ ذہنیتوں کا ماتم کرتے ہیں' ان کی منڈی ہوئی داڑھیوں' بود و باش کے یورپین طریقوں کو شہادت میں پیش کر کے محمد رسول اللہ ؐ کی امت کے دلوں میں ان کی نفرت کا بیج بوتے ہیں' ان کا مذاق اڑاتے ہیں' بھری مجلسوں میں انھیں منبر و محراب سے رُسوا کرتے ہیں۔ اور یہی حال تعلیم یافتوں کا ہے۔ وہ مولویوں کی قدامت پرستیوں' تنگ نظریوں' غربت کی وجہ سے ان کی پست زندگی کے نمونوں پر فقرے کستے ہیں' ان پر چھچھوری حرکتوں کا الزام لگاتے ہیں' معمولی معمولی جزئی غیر منصوص مسائل پر طیش دلا دلا کر مسلمانوں کو لڑانے کا انھیں مجرم ٹھہراتے ہیں۔

غرض مسٹر اور مولوی' ان دونوں کے درمیان ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش جاری ہے' بلکہ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ انھی خانہ جنگیوں میں دین بھی برباد ہو رہا ہے' دنیا بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا اگر برباد بھی ہو جائے تو اس سے تسلی مل سکتی تھی کہ دین تو باقی ہے۔ لیکن آج تعلیم کے ان دو مختلف الجہت نظاموں کے نتیجے میں غیر شعوری طور پر مسلمانوں کے اندر العیاذ باللہ دین کی نفرت پرورش پا رہی ہے۔ دین کے عالموں کی رسوائی کا سلسلہ یونہی جاری رہا تو کہیں خود دین کی رسوائی پر اس ناپاک تحریک کا خاتمہ نہ ہو۔ خاکم بدہن خدانخواستہ اگر ایسا ہوا' اور جو حالات ہیں ان کے دیکھتے ہوئے کیا کہا جا سکتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے' تو اس کا الزام کیا صرف کسی ایک ہی طبقے پر ہو گا؟

کیا عوام کو تعلیم یافتوں اور ملاؤں کے قدموں کی ٹھوکر میں اس طرح ڈالے رکھنا کسی اچھے انجام کی ضمانت ہے؟ مصیبت کا احساس سب کو ہے' لیکن اس کا علاج کیا ہے؟ کیا سکولوں اور کالجوں میں نام نہاد دینیات کے کورس کے اضافے سے اس مصیبت کا خاتمہ ہو جائے گا؟ یا پھر عربی تعلیم گاہوں میں انگریزی کی چند ریڈریں' یا روشن خیال مولویوں کے نزدیک جس چیز کا نام سائنس ہے اس مولویانہ سائنس کی تعلیم اس مرض کا علاج ہے؟ ایسی جھوٹی امیدوں میں تسلی ڈھونڈنا' کیا ایمانی عقل اس پر راضی ہو سکتی ہے؟ مرض کے اسباب کی غلط تشخیص اور اسی غلط تشخیص کی بنیاد پر مریض کا جو غلط علاج ہو رہا ہے' اہل بصیرت اس تماشے کو تقریباً پون صدی سے دیکھ رہے ہیں' اور دل ہی دل میں پڑھ رہے ہیں۔

خوشی ہے سب کو کہ آپریشن میں خوب نشتر یہ چل رہا ہے
کسی کو اس کی خبر نہیں ہے مریض کا دم نکل رہا ہے

میرے نزدیک تو ان ساری تباہ کاریوں اور بربادیوں کے انسداد کی واحد تدبیر' کوئی نئی تدبیر نہیں بلکہ نظام تعلیم کی وحدت کا قدیم اصول ہی ہو سکتا ہے۔ افسوس کہ ہم لوگوں نے اپنے بزرگوں کی قیمت نہیں پہچانی جنھوں نے تیرہ سو سال کی طویل مدت میں علم کی اس دوعملی اور تقسیم کو شدت کے ساتھ روکے رکھا۔ لوگ سوچتے نہیں ہیں' ورنہ میں مسلمانوں کے چند اہم کارناموں میں سے ان کا ایک بڑا کارنامہ تعلیمی نصاب کی اسی وحدت کو سمجھتا ہوں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ان میں وہی تعلیم یافتہ بھی تھے جو علما کہلاتے تھے' اور وہی علما تھے جنھیں آج تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے۔

درس نظامیہ کے متعلق لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی صرف دینی تعلیم کا نظام تھا۔ درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے صحیح معنوں میں خالص دینیات کی کل تین کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ یعنی' چند مختصر فقہی متون کے سوا' قرآن کے متعلق جلالین (جو عربی زبان میں قرآن کا ترجمہ اور مختصر حل ہے)' حدیث کے متعلق مشکوٰۃ' اور فقہ کے سلسلے میں شرح وقایہ اور ہدایہ جو حکماً و عملاً ایک ہی کتاب کی تعلیم تھی۔ ان کے سوا طلبہ جو کچھ پڑھتے تھے' فارسی (یعنی دفتری زبان) کی نظم و نثر کی کتابوں کے علاوہ' منطق' فلسفہ' ہیئت' اقلیدس' ادب عربی' اور بعض ایسے عقلی و ادبی علوم جنھیں خود مسلمانوں نے ایجاد کیا تھا' یعنی علم کلام' اور علم اصول فقہ' معانی و بیان وغیرہ۔ ان علوم و فنون کی اتنی کتابوں کا ختم کرنا ضروری تھا کہ صرف منطق و فلسفے کی کتابوں کی تعداد آخر زمانے میں چالیس پچاس سے متجاوز تھی۔

چنانچہ قدیم نصاب میں قرآن' حدیث' فقہ کو محوری اور اساسی مضمون قرار دے کر' اور درس

کے لیے ہر مضمون کی ایک ایک ٹھوس جامع، حاوی، مختصر کتاب کا انتخاب کر کے، پورے نصاب میں صرف تین کتابوں کو کافی قرار دیا گیا۔ اس کے بعد پڑھنے والوں کے لیے ایک وسیع میدان چھوڑ دیا گیا۔ اس میں جیسی ضرورت تھی، تقریباً ساٹھ ستر غیر دینیاتی کتابوں کی کافی گنجایش نکل آئی۔ پھر جب تک موقع تھا ان غیر دینیاتی مضامین کی حیثیت اختیاری مضامین کی رہی، اور جیسے جیسے زمانے کا مطالبہ بڑھتا گیا ان مضامین میں سے جن کو لازم قرار دینے کی حاجت ہوئی، انھیں لازم قرار دے دیا گیا۔ یوں مسلمانوں کے اس واحد تعلیمی نظام سے فلسفی ملا، مُہندِس ملا، ادیب ملا، الغرض باوجود ملا ہونے کے جس جس چیز کی ضرورت تھی وہی بن بن کر نکلتے رہے۔

میں بزرگوں کے اسی طرز عمل کو پیش کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ آج بھی کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ غیر دینی علوم کے اس حصے کو، جس کے اکثر نظریات و مسائل مسترد ہو چکے ہیں یا کم از کم دنیا میں ان کی مانگ باقی نہیں رہی ہے، ان کو نکال کر عصر جدید کے مقبولہ علوم اور عہد حاضر کی دفتری زبان انگریزی کے نصاب کو قبول کر کے، مذہب کی تعلیم کو ان ہی تین کتابوں کے معیار کے مطابق باقی رکھتے ہوئے، دینی اور دنیاوی تعلیم کے مدارس کی اس تفریق کو ختم کر دیا جائے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ دینی تعلیم کو اس طور پر لازم کر دیا جائے کہ جیسے درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے دین کا علم ان کتابوں کے معیار کے مطابق اپنے پاس رکھتے تھے، اسی طرح بی۔اے کی تعلیم سے فارغ ہونے والے اس زمانے میں بھی اس حد تک مذہب کے عالم ہو کر نکلا کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پھر دینیات کے مدارس کے نام سے الگ عام مدرسوں کے قائم کرنے کی ضرورت مسلمانوں کو باقی نہ رہے گی۔ ہر عالم اس وقت گریجویٹ ہوگا اور ہر گریجویٹ عالم، ملا ہی مسٹر ہوں گے اور مسٹر ملا۔ عالم و تعلیم یافتہ کی تفریق کا قصہ ختم ہو جائے گا۔

ملائیت کہیے یا دینی علوم، ان کے لیے جب صدہا سال تک وہی تین کتابیں کافی سمجھی گئیں، تو پھر آج بھی اسی ملائیت کے لیے یا ایک دینی عالم ہونے کے لیے یہی تین کتابیں کیوں کافی نہ ہوں گی۔ میں نہیں سمجھتا کہ اسکولوں اور کالجوں میں بی۔اے ہونے کے لیے جو کم از کم چودہ سال کی تعلیم ضروری ہے، اس چودہ سال کے نصاب میں دینیات کی ان تین کتابوں (قرآن، مشکوۃ، بدایہ و وقایہ) کی جگہ نہیں نکل سکتی۔ اور بالفرض ان تین کتابوں کے لیے جگہ نہ نکل سکتی ہو، تو کیوں نہ ہم اپنے سارے دینی اور دنیوی تعلیمی نظامات کو بجائے دوئی کے وحدت کے رنگ میں ڈھال لیں، اور اپنا نصاب خود بنائیں۔

سچ یہ ہے کہ بزرگوں کے اس عجیب و غریب نمونے پر جب سے مجھے تنبہ ہوا ہے، یعنی دینیات

کی کل تین کتابوں کے سوا ملائیت کے نصاب کا سارا میدان غیر دینیاتی کتابوں سے بھرا ہوا ہے ' اس وقت سے میں اپنے اندر اس یقین کو پاتا ہوں کہ اسی میدان میں ' قدیم مطالبے والے غیر دینی علوم کو نکال کر ' بہ آسانی موجودہ مطالبوں کے مطابق والے مضامین کے لیے پوری پوری جگہ نکال سکتے ہیں۔

میری تجویز پر پہلا شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ دینیات کی ان تین کتابوں کے پڑھنے کے لیے عربی زبان سے کافی واقفیت ناگزیر ہے ' اور عربی زبان کا سیکھنا آسان نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عربی زبان کے الفاظ کا ایک حصہ تو وہ ہے جس میں قرآن و حدیث و فقہ وغیرہ محفوظ ہیں۔ اردو بولنے والی قوموں کے لیے عربی زبان کا یہ حصہ تقریباً مادری زبان کی حیثیت رکھتا ہے ' یعنی اسی پچاسی فیصد الفاظ اس حصے کے انھیں باضابطہ عربی زبان سیکھے بغیر یوں ہی معلوم ہیں۔ چند اصولی باتوں کے جان لینے کے بعد اس عربی کو آدمی خود بخود سمجھنے لگتا ہے۔ البتہ عربی زبان کا وہ ذخیرہ جس میں ایام جاہلیت و عہد اسلامی کے خالص ادبی نثر و نظم کی کتابیں ہیں یقیناً دشوار ہے۔ لیکن اس عربی کے سیکھنے کی ضرورت ہر اس شخص کو نہیں ہے جو صرف اسلامی امور کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔

دوسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ صرف ان تین کتابوں کے پڑھنے سے کیا اسلام کے دینی علوم میں ماہرانہ قابلیت کوئی حاصل کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عام لزومی واقفیت اور چیز ہے ' اور اختصاص بالکل ایک جداگانہ مقصد ہے۔ میری گفتگو صرف عام و لزومی واقفیت تک محدود ہے۔ درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے عام علما کا جو معیار اسلامی علوم کے متعلق ہوتا تھا ' ان تین کتابوں کو صحیح طور پر پڑھ لینے کے بعد اب بھی ان سے امید کی جاتی ہے کہ اس معیار تک پہنچا جا سکتا ہے۔ باقی رہا اختصاص اور ان علوم میں سے کسی خاص علم میں مہارت خصوصی کا مالک ہونا ' اس کے لیے ظاہر ہے کہ خصوصی مدارج کی تعلیم کی یقیناً ضرورت پڑے گی ' بالکل جس طرح غیر دینی علوم کے معیار کو خصوصی کلاسوں کی تعلیم سے بلند کیا جاتا ہے۔

تیسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے ارباب فکر و نظر نے اب تک جو کچھ سوچا ' سمجھا ' لکھا ' پڑھا تھا ' دین سے ان کا خواہ تعلق نہ بھی ہو ' کیا ان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا مناسب ہو گا؟ علی الخصوص ایسے علوم جن کا دین سے گونہ تعلق بھی ہے ' خصوصاً جن فنون کو مسلمانوں نے اسلام ہی کی صحیح تشریح توضیح کے لیے ایجاد کیا تھا۔ ان علوم کو زندہ رکھنے کے لیے یہ مناسب ہو گا کہ دوسرے اختیاری مضامین کے ساتھ ان مضامین کو بھی اختیاری مضامین کے ذیل میں رکھ دیا جائے ' کچھ لوگوں کا پڑھنا ' پڑھانا ' ان کی بقا اور ارتقا کے لیے کافی ہو گا۔

آخری بات عرض کروں۔ تعلیم کی مدت اگر وہی باقی رکھی جائے جو اس وقت یونی ورسٹیوں میں

مقرر ہے' تو تعلیم کے اس سلسلے کو اس طرح چلانا چاہیے کہ میٹرک پاس کرنے والے معنی اور مختصر مطلب کے ساتھ قرآن ختم کرلیں' انٹرمیڈیٹ پاس کرنے والوں کو مشکوٰۃ یا اسی قسم کا کوئی مجموعہ حدیث پڑھا دیا جائے' اور بی اے پاس کرنے والوں کو فقہ کے متعلق اتنی معلومات حاصل کرلینا چاہیے جو شرح وقایہ اور ہدایہ کے پڑھنے سے حاصل ہوسکتی ہیں۔ قرآن کو تو بہرحال قرآن ہی کے ذریعے سے پڑھانا چاہیے' لیکن مشکوٰۃ و ہدایہ وغیرہ کا تذکرہ میں نے تمثیلاً کیا ہے۔ مقصود معیار کا تعین کرنا ہے' یعنی ان کتابوں کے پڑھ لینے کے بعد حدیث و فقہ میں جتنی دسترس کے حاصل ہونے کی توقع کی جاتی ہے اس کو کسی ذریعے سے حاصل کرنا چاہیے۔

۳۔ **دینی مدارس کا تعلیمی نظام:** یک نار' زیر اہتمام انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' اسلام آباد' ۲۲-۲۴ نومبر' ۱۹۸۶: تعلیم اسلامی تناظر میں' شمارہ ۵

مولانا سید محمد متین ہاشمی: سرسید احمد خان کی تحریک دنیاوی طور پر اصلاحی تحریک تھی' اور نیک نیتی پر مبنی تھی۔ علی گڑھ اور دارالعلوم دیوبند کے نظریات میں جوہری اختلاف نہیں پایا جاتا۔ جو اختلاف نظر آتا ہے اسے طریق کار کے اختلاف کا نام دیا جاسکتا ہے۔ سرسید احمد خان نے یہ محسوس کیا کہ کہیں جدید تعلیم میں سبقت حاصل کر کے ہندو انگریز کے زیر سایہ مسلمانوں پر تسلط نہ حاصل کرلے' اس لیے انھوں نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کے حصول کی طرف متوجہ کیا۔ علماے دیوبند نے یہ دیکھ کر کہ برطانوی سامراج نے جن جن اسلامی ممالک پر اپنا تسلط قائم کیا ہے وہاں کے مسلمانوں کی دینی اقدار کو پامال کیا اور پوری کوشش کے ساتھ ان کے دل و دماغ کو عیسائی بنایا' یہ ضروری سمجھا کہ خیرات کی روٹیاں کھاکر اور چٹائیوں پر بیٹھ کر دینی علوم اور اسلامی تہذیب کی حفاظت کی جائے' اور کمال دیانت داری سے اسلاف کے اس ورثے کو آنے والی نسل تک منتقل کر دیا جائے۔

ایسے مواقع پر ہر جماعت متشدد ہو جاتی ہے' اور اس کا تشدد اور تعصّب ہی اس کی بقا کا ضامن ہوتا ہے۔ کیونکہ جب باہر سے حملہ ہو رہا ہو تو قلعے کے ہر سوراخ کو بند کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مگر دونوں جماعتوں کے اس طرز عمل نے ایک ناقابلِ عبور خلیج مسلمانوں کے دونوں طبقات کے درمیان پیدا کر دی۔ ایک جماعت نے مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز کو آمنّا وصدّقنا کہا' اور دوسری جماعت نے اسے کفر و الحاد گردانا۔ قیام پاکستان کے بعد چونکہ اقتدار جدت پسند طبقے کے ہاتھ میں آیا' اس لیے انھوں نے مغربی افکار اور مغربی علوم کے لیے پاکستان کے دروازے چوپٹ کھول دیے' اور بقول جوش یہ حال ہے۔

چال انگریزی' ڈھال انگریزی' جسم کا بال بال انگریزی
جسم ہندی میں جان انگریزی' اور منہ میں زبان انگریزی

میرے خیال میں مسئلے کا حل یہ ہے کہ نظام تعلیم کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ اسلاف کی روایات کا تحفظ بھی ہو اور عصری تقاضوں کو بھی نظرانداز نہ کیا جائے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اسلامیات کو کالجوں میں داخل کر دینے سے' اور انگریزی اور سائنس کو درس نظامی میں سمو دینے سے ہمارا موجودہ مسئلہ حل ہو جائے گا تو غلط ہے۔ اس اقدام سے شترگربگی پیدا ہوگی' جو دونوں میں سے کسی طبقے کے لیے مفید نہیں ہوگی۔

دینی مدارس سے فارغ ہونے والے افراد کے لیے امام مسجد اور خطیب ہونا ہی کافی نہیں' بلکہ انھیں تمام شعبہ ہائے حیات میں موثر کردار ادا کرنا چاہیے۔ اس کے لیے مدارس کے نظام میں تبدیلی کی اشد ضرورت ہے۔ موجودہ مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ میرے خیال میں صحیح معنوں میں خطیب بھی نہیں ہوتے' صرف چند روایات اور اختلافی مسائل کے حافظ ہوتے ہیں اور امت میں افتراق و انتشار پیدا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کا جو صحیح علم ہونا چاہیے' باوجود آٹھ دس سال لگانے کے ان کی دسترس میں وہ نہیں آتا۔ اس لیے کہ ان کے آٹھ سالہ دور تعلیم میں ان کے چھ سال صرف علوم آلیہ کی تحصیل پر صرف ہوتے ہیں۔ ساتویں سال میں وہ "موقوف علیہ" پڑھتے ہیں' اور آٹھویں سال میں "دورہ حدیث"۔ موقوف علیہ میں وہ صرف جلالین شریف پڑھتے ہیں' جسے تفسیر سے زیادہ ترجمہ کہنا چاہیے۔ بعض مدارس میں تبرکاً بیضاوی' جو صرف سورہ بقرہ تک پڑھائی جاتی ہے' متداول ہے۔ حدیث کی صرف ایک کتاب مشکوۃ پڑھائی جاتی ہے' اور اس کے پڑھانے کا طرز یہ ہے کہ اختلافی مسائل مثلاً آمین بالجہر' رفع یدین اور قرات خلف الامام پر طویل بحثیں ہوتی ہیں۔ ان بحثوں کا نتیجہ یہ ہے کہ علم حدیث جو حقیقی معنوں میں علم الاخلاق' علم الاقتصاد و عمرانیات' علم المعاملات اور علم الاعتقاد کا جامع ہے' محض چند فروعی مسائل کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ اس سے طلبہ میں کج بحثی اور فرقہ واریت پیدا ہوتی ہے۔ دورہ حدیث کا مطلب میرے خیال میں "دوڑ دو" ہے' یعنی چند اختلافی مباحث کے سوا شاگرد خاموش بیٹھا رہتا ہے اور استاد متن حدیث کی تلاوت کرتا جاتا ہے۔

اب حالات یکسر تبدیل ہو چکے ہیں اس لیے نصاب کو بھی تبدیل ہونا چاہیے۔ نصاب کو تبدیل کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس تعلیم کے اغراض و مقاصد کا تعین کر لیا جائے جو میرے خیال میں حسب ذیل ہیں: (الف) قرآن و سنت میں بصیرت تامہ کا حصول' (ب) اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں تعمیر سیرت و کردار' (ج) تبلیغ و اقامت دین' (د) نظریہ پاکستان سے مکمل وابستگی' (ہ) تزکیہ نفس' (و) عصری علوم سے حسب ضرورت واقفیت۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے ابتدائی دو سالوں میں علوم آلیہ' مثلاً صرف و نحو' ابتدائی عربی

ادب بلاغت ' ابتدائی منطق و فلسفہ قدیم کی تکمیل کرائی جائے ' یہاں تک کہ متعلم عربی عبارت پڑھنے اور ترجمہ کر لینے پر قادر ہو جائے ۔ بعد کے چار سالوں میں عقائد و کلام ' فلسفہ جدید کے مبادیات ' منطق جدید ' ترجمہ قرآن مکمل ' فقہ مکمل ' تاریخ عالم و تاریخ اسلام ' جغرافیہ ' مبادیات سائنس ' انگریزی ' اصول فقہ ' اصول حدیث ' اصول تفسیر ' فلسفہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی پڑھا دیا جائے ۔ بقیہ دو سالوں میں تفسیر کی ایک اہم کتاب (میرے خیال میں تفسیر قرطبی) پڑھائی جائے ' اور کوئی ایک جدید تفسیر (مثلاً تفسیر سید قطب یا کوئی بھی تفسیر بطور مطالعہ) داخل درس رہے ۔ دورۂ حدیث کو دو سالوں میں تقسیم کیا جائے ۔ سال اول میں موطا امام مالک ، شرح معانی الآثار ، ابو داود ، سنن نسائی اور سال دوم میں صحیحین ، ابن ماجہ ، نخبۃ الفکر ، موطا امام محمد ، ترمذی پڑھائی جائے ۔

۲۔ مفتی سیاح الدین کاکاخیل : مولانا نظام الدین کے بعد پیدا ہونے والے مصنفین کی کتابیں بھی درس نظامی میں شامل ہیں ' اور مسلسل شامل ہوتی رہتی ہیں ۔ اس لیے اگر حالات کے اعتبار سے بعض کتابیں اب خارج کی جائیں اور بعض اور مفید کتابیں شامل کی جائیں ' تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا ۔ یہ نہ اسلاف کے طریقے سے روگردانی ہوگی ' اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ فوائد فوت ہو جائیں گے جو درس نظامی کے پڑھنے سے حاصل ہوتے رہے ہیں ۔

مگر آج کل درس نظامی کا نام لے کر اس پر جو تنقید کی جاتی ہے یہ بالکل بے جا ہے ' اور کچھ فیشن سا بن گیا ہے کہ ہر کوئی اٹھتا ہے اور اس انداز سے گفتگو کرتا ہے کہ گویا اس نصاب تعلیم نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا ' اور اس کی جگہ کوئی نیا نصاب مرتب کر کے دینی مدارس میں رائج کیا جانا چاہیے ۔ حالانکہ درس نظامی ماضی کے ہر دور میں نہایت ہی کامیاب ثابت ہوا ہے ۔ بڑے بڑے جید علما ' جو تمام علوم پر اچھی طرح حاوی ہوتے تھے اور انھوں نے بہت سے علمی اور عملی کارنامے سرانجام دیے ہیں ' اسی درس نظامی سے پیدا ہوئے ۔

اس لیے میری رائے میں سابقہ علمی خدمات پر پانی پھیرنے اور مخالف تبصرے کرنے کے بجائے یہ سوچا جائے کہ صحیح معنوں میں عالم بننے کے لیے موجودہ حالات میں اس درسِ نظامی کی کن کتابوں کو باقی رکھا جائے ' اور کن کتابوں کو بدل کر ان کے بجائے دوسری ایسی کتابیں رکھی جائیں جن کے پڑھنے سے اصل مقصد حاصل ہو سکے ۔ فلسفہ قدیمہ کی کوئی ایک دو کتابیں تو نصاب میں ضرور رکھی جائیں ' کیونکہ ہمارے تمام دینی لٹریچر میں وہی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں ۔ البتہ اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ ان کے پڑھنے پڑھانے پر اتنا وقت صرف کریں جتنا پہلے صرف کیا کرتے تھے ۔ ان کتابوں کے بجائے جو جدید نظریات ہیں ' اور جن نظریات کی بنیاد پر پوری مغربی تہذیب اور بڑے بڑے ملکوں کے نظام چل

رہے ہیں' ان کو پڑھایا جائے ۔ ان کے بارے میں ایسی کتابیں اردو میں مرتب کی جائیں کہ پڑھنے والے طلبہ کو صرف سرسری اور سنی سنائی باتیں نہیں بلکہ مستند حوالوں کی روشنی میں ہر فلسفے کی اصل حیثیت اور بنیادی اصولوں کا علم ہو۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ ان میں سے ہر فلسفے کی خامیاں' کمزوریاں اور خلاف حقیقت ہونا بھی اچھی طرح سمجھایا اور پڑھایا جائے ۔

اسی طرح دینی مدارس میں کم سے کم درجہ وار اجمالی تاریخ پڑھانا' تاکہ اس مضمون کے ساتھ طلبہ کو انس پیدا ہو اور پھر وہ خود مطالعہ کر سکیں' کسی حد تک نصاب میں رکھنا بھی وقت کی ضرورت ہے ۔ اسی طرح علامہ خضری کی کتاب التشریع الاسلامی بھی فقہ کی کسی کتاب کے ساتھ پڑھائی جائے تاکہ تدوین فقہ کی تاریخ بھی ان کے سامنے ہو ۔ موجودہ دور میں علم معیشت نے بھی خاص اہمیت حاصل کی ہے ۔ اس لیے اسلام کا معاشی نظام بھی باقاعدہ دلائل کے ساتھ پڑھایا اور سمجھایا جائے ۔

میری رائے میں نصابی کتابوں کی تبدیلی سے بڑھ کر اہم چیز طریقہ تعلیم و تدریس ہے ۔ اب تک تفسیر و حدیث اور فقہ پڑھاتے وقت جن مسائل پر اساتذہ اور طلبہ دونوں اپنا سارا زور صرف کرتے تھے وہ زمانہ ماضی سے تعلق رکھتے تھے ۔ ہمارے اس دور میں جدید معتزلہ نے ' جو عقلیت پسندی کے زعم باطل میں مبتلا ہیں ' نئے نئے مسائل کھڑے کیے ہیں اور نئے نئے شبہات پیدا کر رہے ہیں ۔ اب دین کی خدمت یہ ہے کہ تعلیم و تدریس میں ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ طلبہ مدارس سے نکل کر ہرمیدان میں تقریر و تحریر کے ذریعے اس نئے دور کے معتزلہ کا مقابلہ کر سکیں ۔ ہدایہ، ترمذی اور بخاری پڑھاتے ہوئے ' اجتماعی مسائل احادیث کی روشنی میں حل کیا کریں ' تاکہ اساتذہ اور طلبہ موجودہ دور کے تمام پیچیدہ مسائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی روشنی میں بہترین طریقے سے حل کر سکیں ۔

اب رہ گئی یہ بات کہ دینی مدارس میں انگریزی پڑھائی جائے ۔ اگرچہ میں انگریزی زبان کی افادیت اور ضرورت کا قائل ہوں ' لیکن دینی مدارس میں طلبہ کو نصاب کی ان دینی اور فنی کتابوں کے ساتھ انگریزی پڑھانا نقصان دہ سمجھتا ہوں ۔ تجربہ یہ ہے کہ اس صورت میں طلبہ کی زیادہ توجہ انگریزی کی طرف ہو جاتی ہے ' اور دوسری کتابوں کی طرف توجہ باقی نہیں رہتی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل دینی علوم میں بالکل کچے رہ جاتے ہیں ۔ ہاں یہ کرنا چاہیے کہ ایک علیحدہ شعبہ قائم کیا جائے اور جب طلبہ فارغ ہو جائیں پھر خالص انگریزی کی طرف متوجہ ہوں ' اور ان شاء اللہ ان دینی علوم کی برکت سے ذہن اتنا قوی اور صاف ہوا ہو گا کہ تھوڑے عرصے میں اچھی انگریزی سیکھ سکیں گے ۔

۴ ۔ کل ہند اجتماع مدارس اسلامیہ عربیہ : ۲۶ - ۲۸ نومبر ۱۹۹۴ ' دیوبند ' ماہنامہ دار العلوم ' دیوبند ' نومبر ' دسمبر ۱۹۹۴

۱۔ مولانا مرغوب الرحمان مہتمم، دارالعلوم دیوبند: مسلمانوں کی اقبال مندی کا دور بھی دینی اور دنیوی علوم کی تفریق سے خالی نہیں رہا ہے۔ قرآن و سنت کی نصوص میں بھی اس تفریق کے واضح اشارے موجود ہیں۔ رسول پاکؐ نے انتم اعلم بامور دنیاکم اور من یرد اللّٰہ بہ خیراً یفقھہ فی الدین فرما کر علم کو دو خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ الدنیا مطی الآخرۃ کا ارشاد بھی اس تقسیم کی طرف مشیر ہے، اس لیے کہ سوار اور سواری کے فرق کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ مادیت کے فروغ اور مغربیت کے عروج سے آج ہمارا پورا معاشرہ زوال کی زد میں ہے، اس لیے اصلاح و تربیت کی اہمیت و ضرورت پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ طلبہ کے مزاج و مذاق تیزی کے ساتھ تغیر پذیر ہیں، اس لیے یہ مسئلہ نہایت دل سوزی و بالغ نظری کے ساتھ غور و فکر کا طالب ہے۔۔ اس مشینی دور میں عام طور پر طبیعتیں محنت و مشقت کی بجائے سہولت پسند ہو گئی ہیں، جس سے مدارس کے طلبہ مستثنیٰ نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں نہ اب پہلے جیسے دل و دماغ ہیں، نہ پرسکون ماحول۔ اس لیے فن کی بعض وہ کتابیں جو ذہنی ریاضت چاہتی ہیں ان کی متبادل آسان کتب تلاش کی جائیں۔ فنِ تاریخ و سیرت، جو خالص اسلامی فن ہے، ہمارا نصاب اس سے خالی تھا، کسی طرح اسے نصاب میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔

۲۔ مولانا سعید احمد پالن پوری، استاذ حدیث، دارالعلوم دیوبند: کیفیت میں بڑی کمی آ رہی ہے۔ ان مدارس سے رجال کار کی تیاری کا جو کام ہو رہا تھا اس میں بہت کمی آگئی ہے، اور زمانہ ماضی میں جیسے افراد تیار کیے جاتے تھے اب اس معیار کے افراد تیار نہیں ہو رہے ہیں۔ یہ پہلو انتہائی تکلیف دہ ہے۔ جہاں تک کمیت کا تعلق ہے، طلبہ کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔۔۔ لوگ علومِ عصریہ کو دینی مدارس میں، جس انداز میں داخل کرانا چاہتے ہیں، وہ بہت نقصان دہ ہے۔ ہم علوم عصریہ کے مخالف نہیں ہیں، بلکہ فی زمانہ ان کی ضرورت کا احساس رکھتے ہیں۔ مگر ان کو اصلی کا درجہ نہیں دیتے۔ خود دارالعلوم کے شعبہ دینیات و فارسی میں ہندی، انگریزی، حساب اور جغرافیہ وغیرہ موجود ہے۔

۳۔ مولانا سید اسعد مدنی: [بنیادی طور پر نصابِ تعلیم میں تبدیلی کی سخت مخالفت کرتے ہوئے کہا] آج ہم لوگ جس دور سے گزر رہے ہیں وہ بڑا خطرناک ہے، عیسائی اور یہودی طاقتیں اپنے بھرپور وسائل کے ساتھ اسلام کو مٹانے پر تلی ہوئی ہیں، مسلمانوں کے خلاف ان کی عیارانہ سازشیں پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں، ان کا نشانہ خاص طور سے دینی مدارس ہیں۔ مدارس عربیہ اسلامیہ کے نصاب تعلیم میں بنیادی تبدیلیوں کی بات بھی ایسی ہی سازشوں کا ایک خطرناک حصہ ہے۔

۴۔ مولانا ریاست علی: اکابر نے اسلام کی بقا کی خاطر ایک نصاب تعلیم مرتب کیا۔ حضرت نانوتوی کی مختلف تقریروں میں یہ کہا گیا ہے کہ اس نصاب میں وہ فنون شامل نہیں کیے گئے ہیں جو عصری

تقاضوں سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ عصری علوم کے ہزارہا ادارے ہیں۔اس لیے امت میں جس علم و فن کی کمی تھی 'یعنی دینی علوم 'اس کی رعایت کرتے ہوئے اس کے نصاب کو خالص دینی بنیادوں پر قائم کیا گیا۔بعض حضرات سائنس اور علوم جدیدہ کو نصاب میں شامل کرنے کی ضرورت پر بہت زور دیتے ہیں۔ہمیں بھی ان کی افادیت سے انکار نہیں 'لیکن اس اضافے کو ہم دینی مدارس کے مذاق و مزاج کے حق میں نقصان دہ باور کرتے ہیں۔اس سلسلے میں میڈیا کا مسلسل مطالبہ بظاہر ایک سازش ہے۔اس طرح وہ انسان کو مذہب سے غافل اور دین سے دور کرنا چاہتے ہیں۔

۵۔مولانا عبدالعلیم صاحب فاروقی: میرے نزدیک نصاب تعلیم میں تبدیلی نہ پہلے کوئی گناہ تھی 'نہ آج ہے اور نہ آئندہ ہوگی۔زمانہ بدل رہا ہے ' حالات بدل رہے ہیں 'قدریں بدل رہی ہیں ' ان حالات میں ہمیں کس طرح چلنا ہے سب سے زیادہ غور طلب بات یہ ہے۔اگر آپ حضرات نے صحیح فکر سے کام نہیں لیا اور کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے طرز پر اپنے اداروں کو ڈھالنے کی کوشش کی 'تو کل آپ کو قرآن و حدیث کے معنی و مفہوم کو بھی بدلنا پڑے گا۔اس وقت تو آپ یہی کہہ رہے ہیں کہ ہم قرآن و حدیث کو تبدیل کرنا نہیں چاہتے 'لیکن اس کا انجام وہی ہوگا۔ہمیں اور آپ کو ہر حال میں اکابر کی رَوِش پر ہی قائم رہنا چاہیے 'اسی میں عافیت مضمر ہے۔میں جدید تعلیم کا ہرگز مخالف نہیں ہوں ' بلکہ میری تو دلی تمنا ہے کہ مسلمان ڈاکٹر بنیں ' انجینیر بنیں 'سائنس دان بنیں۔لیکن اس کے لیے میں مناسب نہیں سمجھتا کہ دینی مدارس کے طلبہ کو ڈسٹرب کیا جائے۔آج تو ہمارے تقریباً اٹھانوے فیصد بچے مدارس دینیہ کے بجائے اسکول و کالج اور یونی ورسٹیوں ہی کا رخ کر رہے ہیں 'اور اپنے اپنے حوصلے کے مطابق جو بننا چاہتے ہیں 'بن رہے ہیں۔للہ ' ان دو فی صد بچوں کو آپ خالص علوم دینیہ ہی حاصل کرنے دیں۔

۶۔مولانا شاہ ابرار الحق: ہمارے مدارس کی علمی زندگی میں انحطاط کیوں آرہا ہے؟ میں اس سلسلے میں چند باتیں پیش کر رہا ہوں۔جب اساتذہ کا تقرر کیا جائے تو بقدر ضرورت تقویٰ اور ان کی بھرپور صلاحیتوں کا جائزہ بھی لیا جائے۔اساتذہ کے لیے ایک تربیت گاہ کی بھی شدید ضرورت ہے۔ ماہانہ امتحان کا التزام بھی ہونا چاہیے۔اچھے نمبروں پر طلبہ کو انعام سے بھی نوازا جائے۔اس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوگی۔قرآن کریم کی تعلیم پر خصوصی توجہ مبذول رہنی چاہیے۔میں نے بعض مدارس میں معاملہ الٹا دیکھا ہے کہ فارسی اور عربی میں تو طلبہ کی استعداد اچھی ہے لیکن قرآن کریم کی تعلیم پر پوری توجہ نہ ہونے کی وجہ سے اس میں بڑی خامی نظر آئی 'جس سے بہت افسوس ہوا۔جو اصل ہے اس میں کمزوری اور جو وسائل ہیں ان میں پختگی!

ذمہ داران مدارس کو طلبہ کے آرام کا خیال رکھنا ضروری ہے' ان کی پریشانیوں کو دور کرنے کی فوراً کوشش کی جائے۔ اس میں بعض جگہ بڑی کوتاہی ہوتی ہے جو نہیں ہونی چاہیے۔ آپ چندہ کی وصول یابی کے لیے تو اشتہارات میں ان کو مہمانانِ رسول ؐ لکھتے ہیں 'مگر ان کے ساتھ معاملہ دوسرا کیا جاتا ہے' یہ بات بڑی غلط ہے۔ ان پر شفقت کی نظر رکھی جائے۔ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر تعلیم کے لیے آپ کے پاس آئے ہیں' ان کی قدر کی جائے۔ وہ آپ کے محسن معاش بھی ہیں۔ اگر تمام طلبہ چلے جائیں اور مدرسہ خالی ہو جائے' تو کون آپ کو چندہ دے گا؟

۵۔ مولانا ابو عمار زاہد الراشدی: ماہنامہ الشریعہ 'گوجرانوالہ' جنوری ۱۹۹۵

دینی مدارس کے مقاصد کے حصول کے لیے ضروری تھا کہ یہ سرکار کے اثر سے آزاد رہیں اور ان کے تیار کردہ افراد صرف ان کے مقاصد کے خانے میں فٹ ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ دینی مدارس میں انگریزی تعلیم کا داخلہ بند رہا۔ کیونکہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے لازماً سرکاری ملازمت کو ترجیح دیتے اور دینی طلبہ کی ایک بڑی کھیپ اسی طرف منتقل ہو جاتی۔ اس لیے عملاً ایسا طریقہ اختیار کیا گیا کہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل حضرات مسجد و مدرسہ کے سوا کسی دوسری جگہ نہ کھپ سکیں۔ یہ حکمت عملی کامیاب رہی' اور اس کے نتیجے میں برصغیر کے طول و عرض میں دینی مدارس و مکاتب کا جال بچھ گیا' مساجد میں ائمہ و خطبا کی کھیپ بھی فراہم ہوتی رہی' ساتھ ہی ان مدارس نے معاشرے میں قرآن و حدیث کی تعلیم اور اسلامی عقائد و معاشرت کو برقرار رکھا۔ گھر گھر سے مانگی ہوئی روٹیوں اور عام لوگوں کے چندوں کی بنیاد پر قائم ہونے والا دینی مدارس کا یہ نظام برطانوی استعمار کی تہذیبی یلغار کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے ایک مضبوط حصار ثابت ہوا۔

لیکن دینی مدارس کے موجودہ کردار کے بارے میں عام طور پر شکایات کا اظہار کیا جاتا ہے' اور شکوہ کرنے والوں میں ہم بھی شامل ہیں۔ ان شکایات اور دینی مدارس کی مشکلات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا ضروری ہے۔

سب سے بڑی شکایت یہ کی جاتی ہے کہ ان کے نصاب میں آج کے علوم شامل نہیں ہیں اور وہ اپنے طلبہ کو انگریزی' ریاضی' سائنس' انجینیرنگ اور دیگر عصری علوم کی تعلیم نہیں دیتے۔ عصری علوم کی مکمل تعلیم تو دینی تعلیم کے نصاب کے ساتھ پوری طرح شامل نہیں کی جاسکتی' اور نہ ایسا کرنا ضروری ہے۔ شامل اس لیے نہیں کی جاسکتی کہ عالم دین کا مقام حاصل کرنے لیے ضروری علوم کا ایک مکمل نصاب ہے' اور یہ نصاب اس قدر بھاری بھرکم ہے کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے علم یا فن کے مکمل نصاب کو شامل کرنا ممکن نہیں ہے۔ اور ضروری اس لیے نہیں ہے کہ کسی ایک شعبے کے ماہر کے

لیے ضروری نہیں کہ وہ دوسرے شعبے کی مہارت بھی رکھتا ہو۔ اس لیے کسی عالم دین کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ میڈیکل سائنس ' انجینرنگ یا کسی شعبے کی مہارت بھی رکھتا ہو۔

تاہم بنیادی اور جنرل معلومات ہر شعبے کے بارے میں حاصل ہونی چاہییں ' اور اس کی اہمیت و ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح انگریزی آج کی بین الاقوامی زبان ہے ' اسلام اور عالم اسلام کے خلاف صف آرا عالمی میڈیا کی زبان ہے ' اور پاکستان کی دفتری اور عدالتی زبان ہے۔ اس لیے عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان سے کماحقہ بہرہ ور ہونا علما کے لیے آج کے دور میں ضروری ہے۔ اس بنا پر ہم دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں کسی بنیادی تبدیلی یا تخفیف کی حمایت تو نہیں کریں گے ' البتہ اس میں انگریزی زبان اور میڈیکل سائنس ' جنرل سائنس ' انجینرنگ اور دیگر عصری علوم کے بارے میں بنیادی معلومات کی حد تک نصاب کے اضافے کو ضروری سمجھتے ہیں۔

اس سلسلے میں دینی مدارس کی مشکلات کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔ ظاہر بات ہے کہ مساجد و مدارس میں مشاہروں اور دیگر سہولتوں کا مُروّجہ معیار کسی طرح بھی اس درجے کا نہیں ہے کہ کوئی خطیب ' امام یا مدرس اطمینان کے ساتھ ایک عام آدمی جیسی زندگی بسر کر سکے۔ پھر یہاں ملازمت کا تحفظ بھی نہیں ہے۔ اس لیے جو طلبہ انگریزی یا دیگر عصری علوم سے آراستہ ہو جاتے ہیں اور سرکاری اسناد حاصل کر لیتے ہیں ' ان کی اکثریت مساجد یا دینی مدارس کے بجائے ملازمت کے لیے سرکاری اداروں کا رخ کرتی ہے۔ اس کی وجہ سے ضرورت کے مطابق ائمہ ' خطبا اور مدرس میسر نہیں آتے۔ چنانچہ اگر دینی مدارس اپنے تیار کردہ افراد کو مسجد و مدرسے تک محدود رکھنے کے لیے کچھ تحفظات اختیار کیے ہوئے ہیں تو ان کی اس مشکل کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

دینی مدارس سے دوسری شکایت یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے مختلف شعبوں بالخصوص عدلیہ میں مطلوبہ معیار کے رجال کار کی فراہمی کو دینی مدارس کے نظام نے اپنے مقاصد میں شامل نہیں کیا۔ اگر دینی مدارس اپنے نصاب تعلیم کا از سر نو جائزہ لے کر اسلام کو بطور نظام زندگی دوسرے مروجہ نظاموں کے ساتھ تقابل کے ساتھ پڑھانے کا اہتمام کرتے ' اور اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والے حدیث و فقہ کے ابواب کو ضروری اہمیت کے ساتھ پڑھایا جاتا ' تو دینی مدارس سے فارغ ہونے والے علمائے کرام اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد کے تربیت یافتہ اور شعوری کارکن ثابت ہوتے۔ اور اس کے ساتھ اگر تجارت ' عدالت ' انتظامیہ اور دیگر شعبوں کے افراد کے لیے ہلکے پھلکے کورسز تیار کر کے انھیں دینی مدارس کے تعلیمی دائرہ میں شریک کر لیا جاتا ' تو اسلامی نظام کے لیے رجال کار کی فراہمی کی ایک اچھی بنیاد مل سکتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس کے نتائج آج

معاشرے میں فکری انتشار اور اخلاقی انارکی کی صورت میں سب کے سامنے ہیں۔

دینی مدارس سے تیسری شکایت اسلام کے بارے میں مغربی لابیوں اور ورلڈ میڈیا کے منفی پروپیگنڈے کی صورت میں سامنے آنے والے چیلنج کو نظرانداز کرنے کی ہے۔ آج اقوام متحدہ کے چارٹر اور بنیادی حقوق کے مغربی تصورات کے حوالے سے اسلامی احکام اور قوانین کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ جرائم کی شرعی سزاؤں کو انسانی حقوق کے منافی قرار دیا جا رہا ہے' ارتداد اور توہین رسالت ؐ پر قدغن کے بارے میں اسلامی قوانین کو آزادی رائے کے بنیادی حق سے متصادم کہا جا رہا ہے' اور دنیا میں کسی بھی جگہ اسلامی معاشرے کے قیام کو قرون وسطیٰ کے ظالمانہ دور کی واپسی سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ مگر چند استثناؤں کو چھوڑ کر دینی مدارس میں اس چیلنج کے ادراک کی فضا ہی سرے سے موجود نہیں۔ یہ بلاشبہ ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

دینی مدارس سے چوتھی شکایت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اساتذہ اور طلبہ کو گفتگو اور مباحثے کے نئے اسلوب اور ہتھیاروں سے روشناس نہیں کرایا۔ فتویٰ اور مناظرہ کی زبان قصہ پارینہ بن چکی ہے' مگر دینی مدارس بلکہ ہمارے منبر و محراب پر بھی ابھی تک اسی زبان کا سکہ چلتا ہے۔ اخبارات پڑھنے اور ٹی وی دیکھنے والوں کے لیے ہماری زبان اور اسلوب بیان دونوں اجنبی ہو چکے ہیں' مگر ہم کوئی پروا کیے بغیر اسی ڈگر پر قائم ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر دینی مجالس میں تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ آج کی زبان منطق و استدلال کی زبان ہے' مشاہدات کی زبان ہے' کسی بھی مسئلے کو اس کے پس منظر اور نتائج کے ساتھ پیش کرنے کی زبان ہے اور انسانی حقوق کے حوالے سے گفتگو کی زبان ہے' مگر دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کی اکثریت اس زبان سے ناآشنا ہے۔ اور ستم بالائے ستم کہ انگلش اور عربی تو رہی ایک طرف' اردو زبان میں اپنے مافی الضمیر کو اچھی تحریر کی صورت میں پیش کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ایک پختہ کار عالم دین نے شکایت کی کہ فلاں قومی اخبار کو میں نے درجنوں مضامین بھجوائے ہیں' ان میں سے ایک بھی شائع نہیں ہوا۔ میں نے اس اخبار کے ایڈیٹر سے بات کی تو انھوں نے جواب دیا کہ جو مضمون ہمیں پورے کا پورا از سرنو لکھنا پڑے' اسے شائع کرنے کا تکلف ہم کس طرح کر سکتے ہیں؟

دینی مدارس سے پانچویں شکایت یہ ہے کہ مدارس کی اکثریت ایسی ہے جن میں طلبہ کی فکری' دینی اور اخلاقی تربیت کا نظام موجود نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مدارس سے فارغ ہونے والے فضلا کی اکثریت کے ذہنوں میں مشنری جذبے کے طور پر کوئی واضح اور متعین مقصد زندگی نہیں ہوتا۔ اور اگر کسی کے ذہن میں کوئی مقصد ہو بھی تو اس کے مطابق اس کی تربیت نہیں ہوتی۔

دینی مدارس سے چھٹی شکایت یہ ہے کہ ان کا باہمی ربط و مشاورت کا نظام انتہائی کمزور اور قطعی ناکافی ہے۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ مدارس کے قیام میں کوئی منصوبہ بندی اور ترجیحات نہیں ہیں۔ جہاں جس کا جی چاہتا ہے، ضروریات اور تقاضوں کو ملحوظ رکھے بغیر، کسی بھی معیار اور سائز کا دینی ادارہ قائم کر لیتا ہے۔ اور چونکہ اوپر چیکنگ کا کوئی نظم موجود نہیں ہے، اس لیے کارکردگی اور اخراجات کا دائرہ شخص واحد یا زیادہ سے زیادہ اس کے منظور نظر چند افراد تک محدود رہتا ہے۔ ان خود رَو دینی مدارس میں ایک بڑی تعداد ایسے اداروں کی ہے جو تعلیمی اداروں کے بجائے "مذہبی دکانیں" کہلانے کے زیادہ حق دار ہیں، اور ان میں مالی بدعنوانیوں کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا ہے۔ سرکاری زکوٰۃ کے حصول کے لیے دنوں میں نئی مدرسے وجود میں آگئے، اور پھر رشوت، سفارشات اور بدعنوانیوں کے جو دروازے کھلے، انھوں نے دینی اداروں کو بھی دیگر سرکاری محکموں کی صف میں لاکھڑا کیا۔ وہ مدارس جنھوں نے سرکاری زکوٰۃ وصول اور خرچ کرنے میں کسی دینی اور اخلاقی معیار کی پابندی کا تکلف گوارا نہیں کیا، بدقسمتی سے سرکاری ریکارڈ میں انھی کی فہرست زیادہ لمبی ہے۔

پھر چند معیاری دینی مدارس کو چھوڑ کر، اکثر و بیشتر نے عوامی چندے کے حصول کے لیے جو طریقے کچھ عرصے سے اختیار کر لیے ہیں، انھوں نے چندہ دینے والے اصحابِ خیر کو پریشان کر دیا ہے۔ کراچی، فیصل آباد اور گوجرانوالہ جیسے کاروباری شہروں میں رمضان المبارک کے دوران مساجد اور دکانوں پر مدارس کے سفیروں کی جو یلغار ہوتی ہے، اور لوگوں کی توجہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لیے گفتگو کا جو اسلوب اختیار کیا جاتا ہے، اس سے دینی اداروں کے اعتماد اور وقار کا گراف تیزی کے ساتھ نیچے جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پریشان کن صورت حال پاکستان سے باہر لندن میں دیکھنے میں آتی ہے، جہاں مدارس کے سفرا نماز کے بعد دروازے پر رومال بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں، جہاں نمازی گزرتے ہوئے پاؤنڈ اور سکے پھینکتے جاتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ میرے جیسے حساس دینی کارکن کی نظریں شرم سے زمین پر گڑ جاتی ہیں۔ ابھی چند ماہ قبل "جنگ" لندن میں ایک مسلم نوجوان کا مراسلہ شائع ہوا، جس میں اس نے بتایا کہ برطانیہ میں پلنے بڑھنے والے مسلمان نوجوانوں کی اکثریت مساجد میں اس لیے نہیں آتی کہ ایک تو ائمہ اور خطبا کی زبان ان کی سمجھ میں نہیں آتی، دوسرے جن موضوعات پر وہ گفتگو کرتے ہیں ان سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہے، تیسرے ہر نماز کے بعد کسی نہ کسی مدرسے کا سفیر چندے کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور ان کے پاس ہر آدمی کو دینے کے لیے اتنے پیسے نہیں ہوتے۔

کسی بھی طبقے کی کمزوریاں ہمیشہ اس کے خلاف دشمن کا ہتھیار بنتی ہیں، اور دینی مدارس کے نظام سے نالاں قوتوں نے اس کے خلاف ان کمزوریوں کو ہتھیار بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس لیے ان

مدارس کو اور ان کے وفاقوں کو خود احتسابی کا ایک مضبوط نظام قائم کرنا ہو گا' اور اپنی کمزوریوں کو خود اپنے ہاتھوں دور کرنے کا اہتمام کرنا ہو گا۔ ورنہ یہ کمزوریاں ان کے خلاف صرف مغربی لابیوں کی پروپیگنڈہ مہم کا ہتھیار نہیں ہوں گی' بلکہ ان مدارس پر ریاستی کنٹرول کی مہم میں بھی معاون ثابت ہوں گی۔ اس لیے ہم دینی مدارس کے ارباب حل و عقد کی خدمت میں عرض کریں گے کہ:

○ --- تمام مکاتب فکر کے دینی مدارس کے الگ الگ وفاق' اپنا وجود اور نظم قائم رکھتے ہوئے' ایک مشترکہ بورڈ قائم کریں اور مشترکہ معاملات کو اس بورڈ کے ذریعے کنٹرول کیا جائے۔

○ --- درس نظامی کے موجودہ نصاب کو برقرار رکھتے ہوئے' اس میں انگریزی زبان اور عصری علوم کو بنیادی معلومات کی حد تک ضرور شامل کیا جائے۔

○ --- گفتگو اور مباحثے کے جدید اسلوب اور انگریزی اور اردو میں صحافتی زبان سے طلبہ کو متعارف کرایا جائے۔

○ --- اسلام کو بطور نظام حیات پڑھایا جائے اور دیگر نظام ہائے حیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ کرا کے نظام شریعت کی اہمیت و ضرورت کو ان کے ذہنوں میں اجاگر کیا جائے۔

○ --- مدارس کی درجہ بندی کر کے ہر علاقے میں وہاں کی ضروریات کے مطابق مدارس کے قیام کے لیے قومی سطح پر منصوبہ بندی کی جائے۔

○ --- اباحت مطلقہ (فری سوسائٹی) کے مغربی تصور اور انسانی حقوق کے مغربی فلسفے کے پس منظر اور نتائج سے طلبہ کو آگاہ کیا جائے۔

○ --- دینی' اخلاقی اور روحانی تربیت کا بطور خاص اہتمام کیا جائے اور دینی مقاصد کے حصول کے لیے ان میں مشنری جذبہ اجاگر کیا جائے۔

○ --- مالی امداد کے حصول کے لیے باوقار اور آبرومندانہ طریق کار کی پابندی اور غیر معیاری طریقوں کی حوصلہ شکنی کی جائے' اور اس سلسلے میں وفاقوں کی سطح پر ضابطہ اخلاق طے کر کے مدارس سے اس کی پابندی کرائی جائے۔

○ --- اساتذہ کے مشاہروں اور طلبہ کی رہائش' خوراک اور صفائی کے معیار کو بہتر بنایا جائے' اور کام کو پھیلانے کی بجائے تھوڑے اور معیاری کام کو اصول قرار دیا جائے۔

○ --- مسلم معاشرے میں دینی مدارس کی اہمیت' خدمات اور کردار کے حوالے سے معیاری مضامین کی انگلش اور اردو میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔

۶۔ مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی: کلیدی خطبہ 'کل ہند دینی مدارس کنونشن' دہلی' زیر

اہتمام آل انڈیا ملی کونسل ، ۲۳-۲۵ دسمبر ۹۴: ماہنامہ الفرقان ، نومبر دسمبر ۹۴

۱- بنیادی دینی تعلیم اور بچوں کی ضروری عصری تعلیم: کوئی بھی ملک گیر نقشہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مرتب کرنا چاہیے۔ یعنی ایسے خود کفیل مکاتب کا قیام جو مقامی وسائل سے چلائے جائیں ، اور جہاں بچوں کو دین کی ضروری تعلیم کے ساتھ ساتھ موجودہ سیکولر تعلیم سے بھی بہرہ ور کیا جائے ، تا کہ ان کے لیے آیندہ چل کر مدارس عربیہ اور سیکولر تعلیمی اداروں میں سے کسی ایک کی طرف جانے کا راستہ کھلا رہے۔ اس احساس کے باوجود کہ مذہبی اور سیکولر تعلیم کے دو متوازی نظام کا تصور ہماری مصیبت کو دوبالا کر دیتا ہے ، اس ثنویت سے مکمل طور پر نجات کا فی الحال ہمارے پاس راستہ نہیں ہے۔ ہم ہر سطح تک پورے ملک کے لیے ایسے تعلیمی اداروں کے قائم کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں جو دینی اور دنیاوی دونوں ضرورتوں کے لیے کفیل ہو سکیں۔ لہٰذا اس کڑوی حقیقت کے اعتراف کے ساتھ ہمیں اپنا نظام عمل بنانا ہو گا۔

۲- خواتین کی تعلیم: ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ مسلمان ، مرد ہوں یا خواتین ، دونوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ جب تک ہماری خواتین تعلیم یافتہ نہیں ہیں ہمارا گھر سدھر نہیں سکتا ، اور گھر نہیں سدھرتا ہے تو نہ سماج سدھر سکتا ہے اور نہ آنے والی نسلیں صحیح راہ پر چل سکتی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ بنیادی دینی تعلیم سبھی کے لیے فرض عین کا درجہ رکھتی ہے۔ کچھ دنوں سے خواتین کی تعلیم کے لیے کچھ کوششیں ہوئی ہیں ، لیکن یہ کوششیں منتشر اور بکھری ہوئی ہیں۔ ضرورت ہے بہتر منصوبہ بندی کے ساتھ ان منتشر کوششوں کو منظم کرنے کی۔

۳- ہمارا ایک بڑا نازک مسئلہ ان بچوں کو دین سے آشنا کرنے کا ہے جو انگلش میڈیم سکولوں ، سکو سچین مشن اور شیشو مندر کی طرح کے اداروں ، نیز عام سیکولر تعلیمی اداروں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ ہمارا متوسط طبقہ اور اعلیٰ طبقہ انھی سکولوں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلانا پسند کرتا ہے۔ ہزاروں ہزار روپے ان اداروں کو بطور ڈونیشن دیے جاتے ہیں اور پھر بھی داخلہ مشکل ہوتا ہے۔ تعلیم پر خرچہ ، اوسطاً " ہزار ، پندرہ سو روپے تک پڑتا ہے۔ لیکن غربت و افلاس کی شکار یہ قوم یہ بھاری رقم اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے تصور میں شوق سے خرچ کر رہی ہے۔ دوسری طرف ان اداروں میں تعلیم پانے والے بچے دینی تعلیم سے قطعی بیگانہ رہتے ہیں ، حتیٰ کہ وہ قرآن تلاوت کرنے کے لائق نہیں ہوتے۔ سکولوں کا ماحول غیر اسلامی اور مشرکانہ ہوتا ہے۔ اسلامی شعائر اور تہذیب کا پتا بھی بچوں کو نہیں ہوتا ، اور وہ سارے عمل جسے دیکھ کر ایک مسلمان کو چونک جانا چاہیے یہ بچے ان اعمال کو آہستہ آہستہ خوش دلی کے ساتھ قبول کرتے جاتے ہیں۔ کچھ ہی لوگ ہیں جو اپنے بچوں کے لیے کسی مولوی

صاحب کو آدھا گھنٹہ یا گھنٹہ بھر کے لیے ٹیچر مقرر کر لیتے ہیں لیکن اس تذبذب ارتداد کے اثرات کا ازالہ نہیں ہو پاتا۔

۴- دینی مدارس : مدارس کے فضلا دراصل تفقہ فی الدین کے اس فرض کفایہ کی ادائیگی کے ذمہ دار ہیں جس کا مطالبہ قرآن نے کیا ہے' اور قرآنی ہدایت کے مطابق انھیں راہ نمائی' دعوت اور انذار کی نازک ذمہ داریاں انجام دینی ہیں۔ظاہر ہے کہ اس تفقہ فی الدین سے مراد اصطلاحی فقہ اور چند احکام و مسائل کا جان لینا ہی کافی نہیں ہے' بلکہ اس سے مراد وسیع تر افق میں گہرے مطالعے اور تحقیق و تجسس کے ذریعے حکمت دین اور حکمت دعوت کی وہ سمجھ ہے جو انھیں دین کو برپا کرنے کی کوششوں کا اہل بنا سکے۔اس فرض کی ادائیگی کے لیے ایسے علما کا وجود ضروری ہے جو کتاب و سنت کو براہ راست سمجھنے کے لیے عربی زبان و ادب کے رموز سے آشنا ہوں' جن کی نظر مقاصد شرع پر ہو' جو مدارج احکام میں فرق کر سکتے ہوں' جو دعوت کے عمومی اپروچ اور مخصوص مخاطبین اور مخصوص حالات میں خصوصی اپروچ کے درمیان امتیاز کر سکتے ہوں' جن کی نظر حالات زمانہ اور بدلتے ہوئے عرف و عادات' قوموں وملتوں کی نفسیات' ان کے ذہن و فکر کی تشکیل میں ان کی تاریخ کے اثرات' نئے حالات میں اصول و احکام شرع کی تطبیق اور سلف کی کوششوں کے ذخیرے پر ہو۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے مدارس دینیہ نے ایسے فضلا پیدا کیے ہیں جو کم و بیش ان صلاحیتوں سے مزین ہیں۔لیکن ہمیں اس کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ آج عام طور پر مدارس اسلامیہ کے قیام و تاسیس کے بنیادی اغراض و مقاصد اور ان کا خصوصی تصور ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتا جارہا ہے' اور ہم رسمی اور روایتی نظام تعلیم کے اسیر ہو کر اپنی منزل سے دور ہوتے جارہے ہیں۔

• اب تک جو اصلاحی کوششیں ہوئی ہیں' ان کا اگر جائزہ لیا جائے تو بنیادی طور پر درس نظامی اپنی خصوصیات کے ساتھ بہرحال ہر نئے نصاب تعلیم میں نظر آتا ہے۔بنیادی موضوعات میں وقتاً فوقتاً غیر محسوس طریقے پر تبدیلیاں' کمی اور زیادتی ہوتی رہتی ہیں۔خوش گوار اضافہ عام طور پر مدارس میں ترجمہ قرآن سے متعارف کرانے کی صورت میں ہوا۔اصول تفسیر میں شاہ صاحب کی الفوز الکبیر آج بھی ہر جگہ داخل نصاب ہے۔کتاب و سنت اور فقہ اسلامی میں گہری مہارت کی ضرورت سے' یا ضروری حد تک منطق قدیم اور فلسفہ قدیم کی اصلاحات و مبادی سے واقفیت کی اہمیت سے کیسے انکار کیا جاسکتا ہے۔مگر عقائد و کلام کے مسائل سے' جو سابق میں زیر بحث رہے ہیں اور آج بھی نئی صورتوں میں ابھر رہے ہیں' واقف رہنا بہرحال علما کی ذمہ داری ہے۔

پس مسئلہ مروج نصاب تعلیم میں کسی جوہری تبدیلی کا نہیں ہے۔کچھ ان مقصدی علوم میں

اضافے، مسالک فقہیہ کے تقابلی مطالعے، کتاب و سنت کی تعلیم و تدریس کے لیے نئے اپروچ اختیار کرنے، جدید سوالات کو حل کرنے، اور اسلام کو درپیش مختلف علمی چیلنجز کا سامنا کرنے کی اہلیت پیدا کرنے کی، اور آج کے افکار و نظریات پر نگاہ اور کتاب و سنت کی روشنی میں ان پر نقد اور رد و قبول کا فیصلہ کرنے کی استعداد کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے کچھ ان موضوعات کا اضافہ ضروری ہو سکتا ہے جو اس کائنات کی نت نئی تبدیلیوں، سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ جدید معاشی نظریات کے ناقدانہ مطالعے اور فقہ اسلامی کے مذکور معاشی اصول کو موجودہ دور کے تناظر میں سمجھنے، اور موجودہ حالات پر ان کی تطبیق کرنے کے لیے کچھ بنیادی واقفیت بھی ایک عالم کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح دعوت کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے اگر بین الاقوامی ملکی یا قومی زبان پر قدرت ضروری ہو تو اس کی تعلیم کے بھی مختلف مدارج قائم کیے جا سکتے ہیں۔

بہرحال ہمیں مدارس کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کا ایسا ادارہ بنانا ہو گا جن سے پیدا ہونے والے فضلا ایک طرف سرچشمہ علوم و نبوت سے مربوط، اور دوسری طرف اپنے عہد و زمانے سے آشنا اسلام کی صحیح نمایندگی کے اہل، اخلاق و کردار کے اعتبار سے نمونہ اور اپنے وقت کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے اہل ہوں۔ صورت حال ایسی ہے کہ ہمارے پاس موجودہ مدارس انتشار و افتراق کے شکار، ہر جگہ تعلیمی معیار کے فقدان اور اخلاق و کردار کی بہتر تربیت سے محروم ہیں۔ کیا اس صورت حال میں مدارس کی اصلاح کے لیے کچھ کرنا چاہیے یا نہیں؟ اور ہاں تو کیا؟ اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔

۷۔ فرید احمد پراچہ

ناگزیر ہے کہ درس نظامی کے نصاب پر از سر نو غور کیا جائے، اور اس میں ترمیم و اضافے اور تنقیص و اصلاح کو عمل میں لایا جائے۔ اس سلسلے میں میری تجاویز حسب ذیل ہیں:

موجودہ نصاب میں سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں پورا قرآن مجید شامل نصاب نہیں۔ قرآن پاک علوم کا مرکز و محور بلکہ منبع و مصدر ہے۔ اس کا مطالعہ انسان کو علم کی اوج گاہیں بھی عطا کرتا ہے اور کردار کی عظمت بھی۔ چنانچہ ضروری ہے کہ پورا قرآن مجید با ترجمہ و تفسیر شامل نصاب ہو، اور اسے آٹھ سالوں پر تقسیم کر دیا جائے۔ نیز خصوصی مباحث الگ پڑھائے جائیں۔ موجودہ شامل نصاب تفاسیر، جلالین اور بیضاوی، علوم و فنون کا خزانہ ہونے کے باوجود دور حاضر میں کماحقہ راہ نمائی فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔ جبکہ موجودہ زمانے کی کئی عربی تفاسیر زبان و بیان اور مطالب و مفاہیم کے

جملہ تقاضے پورے کر سکتی ہیں۔ قدیم تفاسیر میں سے تفسیر قرطبی اور جدید تفسیر میں سے فی ظلال القرآن کو شامل کرنا بھی مفید رہے گا۔

فقہ و اصول فقہ کے نصاب میں کسی اضافہ و کمی کی ضرورت نہیں ' البتہ دورِ جدید کے مسائل مثلاً بلاسود بنکاری ' عائلی قوانین وغیرہ کو الگ مباحث کے طور پر پڑھایا جائے۔ نیز اصول فقہ بھی جدید انداز میں پڑھایا جائے ' اور فقہ کو منضبط (Codify) کیا جائے۔ آج عدلیہ کے لیے ایسے افراد ناگزیر ہیں جو علوم دین کے ماہر ہوں اور فقہ کو جدید انداز میں سمجھتے ہوں۔

منطق میں نصابی کتب دور از کار بحثوں پر مشتمل ہیں ' اور طلبہ کی صلاحیتوں کا ایک بڑا حصہ ان کتب کو محض سمجھنے پر صرف ہوتا ہے ' جبکہ اس منطق کی پوری عملی زندگی میں کہیں ضرورت نہیں پڑتی۔ اسی طرح یونانی فلسفہ بھی ایک قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ چنانچہ منطق و فلسفہ دونوں یکسر ختم کر دیے جائیں۔ ان کی جگہ اسلام اور سائنس کا مضمون متعارف کرایا جائے ' جس میں سائنس ' اس کے اصول ' سائنسی قوانین و نظریات ' سائنسی ایجادات وغیرہ کا مختصر اور آسان تعارف کرایا جائے۔ قدیم مسلمان سائنس دانوں کی خدمات کا جامع تذکرہ بھی ہو۔

صرف و نحو کی کتب بلاشبہ نہایت مفید ہیں ' لیکن ان میں گرامر کی بجائے گرامر کے فلسفے کو اہمیت دی گئی ہے۔ نہایت سائنٹیفک انداز میں مرتب کردہ جدید کتب سے استفادہ کیا جانا چاہیے ' مثلاً النحو الواضح ، البلاغة الواضح اسی طرح کافیہ اور شرح جامی کی جگہ المغنی یا ابن عقیل وغیرہ شامل کی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح ' عربی ادب و بلاغت کی نصابی کتب میں سے مقامات حریری کو خارج کیا جا سکتا ہے۔ ان کی جگہ جدید عربی لٹریچر میں سے کوئی کتاب شامل کی جائے۔ عربی بول چال اور تحریر کو بنیادی اہمیت حاصل ہو۔ کتنی بدقسمتی ہے کہ ہمارے علماکرام عربی زبان کے ماہرین ہونے کے باوجود عربی میں ایک جملہ بھی بولنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ اساتذہ و طلبہ عربی رسائل و جرائد کے مطالعے ' کی عادت بنائیں ' اور کمرہ جماعت کی زبان عربی ہو۔

علم کلام کے ذریعے جن فرقہ باطلہ کا رد و استیصال سکھایا جاتا ہے ' ان کا اب کہیں وجود نہیں۔ چنانچہ اب اس مضمون کو اسلام اور مذاہب عالم کا نام دے کر اس کے ذریعے عیسائیت ' یہودیت ' بدھ مت ' ہندومت ' کمیونزم ' سرمایہ دارانہ نظام ' صیہونیت ' قومیت پرستی وغیرہ کا تقابلی جائزہ ' اور موجودہ فتنوں مثلاً انکار حدیث ' قادیانیت وغیرہ کا رد سکھایا جائے۔

انگریزی زبان کے غلبہ و حاکمیت سے انکار و مفر ممکن نہیں۔ قدیم دور میں علماے کرام نے یونانی زبان کو رد کرنے کے بجائے اس میں مہارت حاصل کی ' اور یونانی علوم کو عربی میں منتقل کیا۔ آج علوم

کی زبان انگریزی ہے۔اس سے راہ فرار اختیار کرنے کی بجائے ضروری ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ کو اس کی تعلیم دی جائے۔ایک عملی صورت یہ ہے کہ فارغ التحصیل حضرات کے لیے کم از کم دو سالہ نصاب انگریزی شروع کیا جائے۔

ہمارے علماے کرام عالم اسلام کے بڑے بڑے مسائل سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوتے۔ ضروری ہے کہ طلبہ کو سبقاً سبقاً عالم اسلام کے سیاسی، معاشی و معاشرتی احوال سے آگاہ کیا جائے۔پھر بالخصوص مطالعہ پاکستان کو اسی طرح نصاب کا حصہ بنایا جائے۔

تاریخ اسلام، بالخصوص سیرت النبی اور تاریخ خلافت راشدہ کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔اسی طرح حضرات انبیاکرام سے دور حاضرہ تک تاریخ دعوت کو نصاب کا حصہ بنایا جاسکتا ہے۔

ساتویں سال اسلامی نظریہ حیات کو اس انداز میں پڑھایا جائے کہ اسلام کا معاشی نظام، مبادیات معاشیات کی تشریح و توضیح کے ساتھ، اسلام کا سیاسی نظام، جدید سیاسی نظریات کے تقابل کے ساتھ، اسلام کا معاشرتی نظام، جدید معاشرتی افکار کے ہمراہ، بالکل واضح ہو جائے، طلبہ کو اسلام کی جامعیت اور اس کے کامل ترین ضابطہ حیات ہونے کا کماحقہ علم حاصل ہو اور وہ پڑھے لکھے طبقہ میں اسلامی نظام کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح اجاگر کر سکیں۔نصاب کی تبدیلی کا یہ عمل بذریعہ وفاق ہاے مدارس عربیہ اگر ہو گا تو اپنی نتیجہ خیزی اور قبولیت کے لحاظ سے زیادہ بہتر رہے گا۔

درس نظامی کی بیش تر کتب قدیم طرز تحریر اور انداز میں طبع ہوتی ہیں۔اسی طرح حواشی در حواشی کے سلسلے کی صورت میں کتاب کی ایسی صورت بن جاتی ہے کہ اس سے استفادہ کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔ان کتب کو نئے سرے سے طبع کروایا جائے۔ تمام حواشی کو ترتیب وار، صفحہ نمبر اور حوالہ نمبر کے ساتھ کتاب کے آخر میں یکجا کر کے شامل کر دیا جائے۔نیز قدیم کتب کی تبویب کی جائے، اور ہر باب کے آخر میں سوالات اور تمرینات کو تحریر کیا جائے۔اسی طرح ان مضامین پر کتابیں تیار کی جائیں جو پہلے شامل نصاب نہیں۔مثلاً اسلام اور سائنس اور اسلامی نظریہ حیات وغیرہ۔

پہلے سال سے ہی اساتذہ باقاعدہ نوٹس لکھوائیں اور طلبہ کو ہوم ورک دیا جائے مضامین اور مقالے لکھنے کا۔اس طرح طلبہ میں تحریر کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ ہمارے مدارس میں کتب خانے منظم اور بھرپور نہیں۔بعض جگہ صرف کتابوں کے قدیم اور بوسیدہ نسخے موجود ہیں، جبکہ کتابوں کی تعداد انتہائی قلیل ہے۔کتب خانے مدارس کا جزو لاینفک ہیں۔ضروری ہے کہ مدارس انھیں از سرنو ترتیب دیں، کتب میں اضافہ، اور انھیں دور حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔

سال میں ایک مرتبہ تعلیمی سیاحت کو بھی رواج دیا جائے۔اس طرح علمی معلومات میں بھی اضافہ

ہو گا اور طلبہ میں وسعت نظر بھی پیدا ہو گی۔ نیز تفریح کے فطری تقاضے کو بھی مثبت انداز میں پورا کیا جا سکے گا۔ بیش تر دینی مدارس میں صباحی خطاب (اسمبلی) کا کوئی اہتمام نہیں۔ مناسب رہے گا کہ اگر صبح کا آغاز اجتماعی شکل میں کیا جائے۔

جس طرح کالجز میں این سی سی کی ٹریننگ کا سلسلہ ہے' اسی طرح دینی مدارس کے لیے بھی یہ سہولت حاصل کی جائے تاکہ دینی مدارس کے طلبہ جہاد کی عملی مشق حاصل کر سکیں۔

یورپ و امریکہ وغیرہ میں ہفتہ میں ایک روز عملی کام یا فیلڈ ورک شامل نصاب ہوتا ہے۔ دینی مدارس کے طلبہ بھی مہینہ میں دو مرتبہ عملی کام کریں۔ ان کاموں میں خود مدرسے کے کام' کھیتی باڑی' رنگ و روغن' تعمیر و مرمت' یا فیلڈ میں دعوت و تبلیغ اور خدمت خلق کے کام شامل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح طلبہ مستعد رہیں گے۔ ان کی صحت بھی بہتر ہو گی۔ ان سے روایتی سستی و کاہلی اور آرام طلبی کے طعنے بھی دور ہو سکیں گے۔

ماحول بھی تعلیمی پروگرام پر مثبت و منفی دونوں نقوش ڈالتا ہے۔ دینی مدارس کے ماحول کو بھی اسی نقطہ نظر سے ترتیب دینا چاہیے کہ طلبہ میں صحت مند خیالات پرورش پائیں اور ان کی سیرت و کردار کی اسلامی سانچے میں تعمیر ہو۔ مثلاً' مدرسہ کی عمارت کھلی' ہوادار اور صاف ستھری ہو۔ تنگ و تاریک اور پر گھٹن ماحول میں پرورش پانے والے ذہنوں میں بھی تنگ نظری' تاریکی اور گھٹن پیدا ہو جاتی ہے۔ طلبہ میں صفائی کے مقابلے کروائے جائیں' ان کے کمرے صاف ستھرے ہوں' بستر ترتیب وار ہوں' کپڑے صاف اور اجلے ہوں' جوتے پالش ہوں ـــــ یہ چیزیں ایمان کا حصہ ہیں لیکن انھیں دینی مدارس کے طلبہ نے اپنے لیے شجر ممنوعہ سمجھ رکھا ہے۔

آپ کسی سے کوئی وعدہ کریں:

--- کسی وقت ملنے کا'

--- کسی وقت پر کہیں پہنچنے کا'

--- کسی مدت میں کوئی کام کرنے کا'

--- کسی ملازمت میں پابندی وقت کا'

--- کسی قرض کو کسی وقت پر ادا کرنے کا'

اپنے آپ سے کوئی عہد کریں:

--- صبح فجر کے لیے وقت پر اٹھنے کا'

--- کسی کو اس کے حق کی ادائیگی کا'

--- کوئی کام ہو جانے پر انفاق فی سبیل اللہ کا'

--- کسی گناہ پر استغفار کے ساتھ کفارے کا'

--- نظام الاوقات بنا کر اس کی پابندی کا'

اس عہد کو' اس وعدے کو پورا ضرور کیجیے

اپنے وعدوں کو سنجیدگی سے لیجیے' انھیں پورا کرنا ضروری جانیے
وعدہ پورا کرنے والے کی ایک شخصیت ہوتی ہے۔
اور وعدہ پورا نہ کرنے والے کی دوسری شخصیت ہوتی ہے۔

اپنی شخصیت کو دوسروں کی نظر میں' اور اپنی نظر میں بھی' قابل اعتماد بنایئے

اور اس عہد کو بھی پورا کیجیے
جو الست بربکم کے جواب میں آپ نے بلیٰ کہہ کر کیا تھا۔
اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۴)

(بندہ خدا)

آج کا داعی ، کل کا قائد

اپنی تربیت آپ

محمد بشیر جمعہ

لیڈر بننے کے اصول اور طریقے

آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لیے ہمارے اندر حوصلہ اور امنگ ہونا نہایت ضروری ہے۔ ماہرین نے یہ حوصلہ اور امنگ پیدا کرنے کے لیے چار تکنیک بتائی ہیں:

۱۔ اپنے لیے ایسے مواقع فراہم کریں جن کی وجہ سے ہم کچھ حاصل کر سکیں 'سیکھ سکیں اور اپنے خیالات کو سدھار سکیں۔

۲۔ ہم اپنے سامنے مثبت عزائم رکھیں' ان کا زبان و قلم سے اظہار کریں' تاکہ ہمارے اندر عمل کا جذبہ پیدا ہو۔

۳۔ ہم اپنے منفی خیالات کو سختی کے ساتھ رد کر دیں تاکہ مایوسی اور بے عملی کا شکار نہ ہوں۔ جیسے ہی اپنے بارے میں' اپنے حالات کے بارے میں' اپنے ساتھیوں کے بارے میں کوئی منفی خیال کی تاریکی دل میں آئے' فوراً کسی مثبت خیال کے غور سے اسے دفع کر دیں۔

۴۔ اپنے کاموں کو بہتر بنانے کے لیے اپنی ذاتی فائل میں کارکردگی کے پروگریس چارٹ بنائیں۔

بد قسمتی سے ہمارے ملک میں اداروں کی صورت حال یہ ہے کہ نہ ہم لیڈر بناتے ہیں اور نہ ہی لیڈروں کو اپنے میں جذب کر سکتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات جن لوگوں میں لیڈر بننے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے' انھیں اپنے رویے سے رو گرداں کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے تنظیم جمود اور بیورو کریسی کا شکار ہو جاتی ہے۔

تنظیمی طور پر اس قسم کے پروگرام ہونے چاہییں جن میں لیڈر شپ کی مطلوبہ صلاحیتوں پر گفتگو ہو' اور اس لحاظ سے افراد کی تربیت ہو۔ بے جان' بے ہدف' اور مارے باندھے کے پروگرام برائے

پروگرام کے انداز کے تربیتی پروگراموں میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

قیادت کے عناصر:

الف ۔شخصیت

ہمیں اپنی شخصیت پہچاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔اس کے ساتھ ساتھ اس کی تعمیر اور ارتقا کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔

۱۔اہداف اور منصوبہ بندی: اس سلسلے میں:

(۱) آپ اپنے اہداف و مقاصد کا ایک خاکہ متعین کریں 'بلکہ انھیں لکھ لیں۔

(۲) اپنی شخصیت کو ان اہداف و مقاصد کے مطابق بنانے کی منصوبہ بندی کریں۔

(۳) یہ سوچیں کہ آپ میں کیا کیا غلط اور تخریبی عادتیں موجود ہیں 'جنھیں ترک کر دینا چاہیے۔ ایک فہرست بنالیں۔

(۴) آپ کو کن کن تعمیری اور اچھی عادتوں کی ضرورت ہے 'جنھیں اختیار کرنا چاہیے۔ ان کی بھی فہرست بنالیں۔

(۵) آپ کو اپنی شخصیت کی تعمیر کے لیے کن کن اوزاروں کی کس قسم کے سامان (علم و فن) کی 'اور کن طریقوں کی ضرورت ہوگی 'جنھیں آپ استعمال کر سکیں گے۔

۲۔آپ کو اپنی شخصیت کے اظہار کے لیے چند چیزوں کو ترک کرنا ہوگا اور چند چیزوں کو اپنانا ہوگا۔ جن چیزوں کو ترک کرنا ہوگا وہ درج ذیل ہیں:

(۱) شک کی کیفیت :- یہ آپ کے ارادوں کو کمزور کرتی ہے۔

(۲) غیر ضروری تفکرات :- یہ منفی انداز فکر کی طرف لے جاتے ہیں۔ان کے باعث شخصیت زوال پذیر ہوتی ہے اور طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں ' اور انسان اپنے آپ کو ملامت کرنے لگتا ہے۔جو حالات و واقعات اور امور آپ کے اختیار سے باہر ہوں ان کی فکر تو بالکل ترک کر دیں۔

(۳) خوف :- یہ نہ ترقی کرنے دیتا ہے اور نہ ہی تیاری کرنے دیتا ہے۔خدا کی ذات پر مکمل بھروسہ رکھیں۔

(۴) سستی اور کاہلی اور ٹال مٹول کی عادت اور آج کا کام کل پر موخر کرنے کا رویہ۔

۳۔جن چیزوں کو اپنانا ہوگا ' وہ یہ ہیں:

(۱) یقین :- تمام امور ' سرگرمیوں اور شخصیت کا مرکزی نقطہ یہی ہے۔اسی یقین کو مستحکم کرنے

کی کوشش کیجیے۔

(۲) اعتماد:۔ جو کچھ آپ کو آتا ہے اور جو کچھ آپ کے پاس ہے اور جو کچھ آپ آیندہ استعمال کر سکتے ہیں 'ان چیزوں کے بارے میں پر اعتماد رہیے اور اس اعتماد کو بڑھانے کی کوشش کیجیے۔

(۳) ہمت:۔ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا جذبہ اور حالات کا مقابلہ کرنے کا عزم پیدا کیجیے۔

۴۔ اپنی درج ذیل ذاتی خوبیوں کو بڑھانے کی کوشش کیجیے۔

(۱) رویہ۔ (۲) اپچ۔ (۳) مشاہدہ۔ (۴) توجہ۔ (۵) تکمیل۔ (۶) تعمیری و تخلیقی خیالات۔ (۷) قوت فیصلہ۔ (۸) حالات سے مطابقت۔ (۹) انتظامی قابلیت۔ (۱۰) اظہار خیال کی اہلیت اور (۱۱) علم۔

۵۔ درج ذیل برائیوں اور خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کیجیے۔

(۱) خود ملامتی۔ (۲) حساسیت۔ (۳) خود غرضی۔ (۴) بد مزاجی۔ (۵) کمزوری۔ (۶) نفرت۔ (۷) بے قناعتی۔ (۸) بے دلی۔ (۹) رنج۔ (۱۰) غصہ۔ (۱۱) حسد اور بغض۔

درج بالا امور کے سلسلے میں کم از کم چھ ہفتے کی منصوبہ بندی کریں اور اسے ہر ہفتے کے لیے چھوٹے چھوٹے اہداف میں تقسیم کریں اور جائزہ لیتے رہیں۔

ب۔ دلوں میں جگہ بنایئے

لیڈر بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ شخص لوگوں میں پسند کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو جب لوگوں سے اس کی ملاقات ہو تو لوگ خوش ہوں 'اور انھیں احساس ہو کہ وہ ایک اچھے فرد سے مل رہے ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں جگہ بنانے کے لیے کافی محنت' مشقت اور قربانیوں کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں چند تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ ایک سروے میں جب پوچھا گیا کہ وہ لوگوں میں کس قسم کی خوبیاں دیکھنا پسند کرتے ہیں تو اکثریت کا جواب ان چار نکات پر مشتمل تھا:

(۱) ذہانت۔ (۲) خوش مزاجی۔ (۳) دوستانہ رویہ اور (۴) ہم مزاجی۔

۲۔ ہر کام اللہ کے لیے کیجیے اپنی شخصیت میں راست بازی 'صدق دلی' بے ریائی اور سچائی کو اپنایئے۔ لوگوں میں آپ کی محبت اور احترام میں اضافہ ہو جائے گا۔

۳۔ اپنی زندگی کا بنیادی اور راہ نما فلسفہ ہمیشہ اپنے سامنے رکھیے۔ لوگ آپ کی استقامت کو دیکھ

کر آپ کو پسند کریں گے۔

۴۔ معاملات اور تعلقات میں بے غرض بن کر رہیے۔ لوگوں اور دوستوں سے زیادہ توقعات مت رکھیے۔ خوش گوار تعلقات اور ماحول برقرار رکھنے کے لیے لوگوں سے توقعات کا کم ہونا بہت ضروری ہے۔

۵۔ لوگوں کی اچھائیوں اور خوبیوں کو تلاش کرنے کا رجحان اپنایئے۔ لوگ آپ کو بھی اچھا تصور کریں گے۔

۶۔ خوش و خرم رہیے۔ مسکراتے رہیے۔ مسکراتا چہرہ حضور اکرم ؐ کی سنت اور آپ ؐ کی ہدایت ہے۔ مسکراتے چہرے کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مسکراہٹ کے باعث قدرتی طور پر ذہانت کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ لوگ آپ کو اپنا دوست اور رفیق تصور کریں گے۔

۷۔ اپنے جذبات اور موڈ کو کنٹرول میں رکھیے۔ جھنجلاہٹ اور غصے کا شکار مت ہو جایئے۔ غیر معمولی حالات میں بھی گھبراہٹ اور پریشانی سے بچتے رہیے۔

۸۔ اپنی ذات کا احترام کیجیے اور اپنا وقار بلند رکھیے۔ عمر ، ماحول اور ذمہ داریوں کا خیال رکھتے ہوئے کردار ادا کیجیے۔

۹۔ اپنی ظاہری شخصیت کو بھی بہتر بنایئے۔ اپنی خامیوں کو دور کیجیے۔ غیر پسندیدہ حرکات کو ترک کیجیے۔ لوگوں کے سامنے ناک اور کان میں انگلی مت ڈالیے۔ دانتوں کو صاف رکھیے۔ بالوں کو سنواریے۔ صحت کا خیال رکھیے۔ سادہ اور مناسب کپڑوں کا انتخاب کیجیے۔ کپڑوں پر زیادہ رقم مت خرچ کیجیے۔ لیکن نامناسب کپڑوں کے باعث اپنی شخصیت کا غلط تاثر بھی مت دیجیے۔

۱۰۔ اپنی گفتگو اور بات کرنے کے انداز کو بہتر بنایئے۔ آواز میں شیرینی پیدا کیجیے۔ اپنی مادری زبان کو درست کیجیے۔ اپنی گفتگو کو بہت ساری زبانوں کا اچار مت بنایئے۔

۱۱۔ اخلاق عامہ اور طور طریقوں (ایٹی کیٹ) کے مقبول عام اصولوں اور قواعد کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں اپنایئے۔

۱۲۔ کسی ایک علم یا فن میں کمال ضرور حاصل کیجیے ورنہ آیندہ آپ اپنے آپ کو خسارے میں محسوس کریں گے۔ آیندہ صدی کے تقاضوں کے بارے میں معلومات حاصل کیجیے اور اس سلسلے میں اپنی ، اپنے ساتھیوں اور اپنی نسل کی تربیت کیجیے۔

۱۳۔ ضرورت کو پہچاننے کا نازک شعور پیدا کیجیے ، جسے اصطلاح میں فراست کہتے ہیں۔ مستقبل کے معاملات کی پیش بینی اور خطرات کو بھانپنے اور سازشوں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کیجیے۔ قوت فکر

بڑھاپے اور مستقبل کے بارے میں اپنی سوچ کو بنانے کی کوشش کیجیے۔

۱۴۔ دوسرے لوگوں کی عزت نفس کا خیال رکھیے۔ ان کی خوبیوں اور کارناموں کی حوصلہ افزائی کیجیے۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کی شخصیت کے بارے میں ناروا تبصرہ مت کیجیے۔ وہ شخص تو اس تبصرے کو نہیں سن رہا، خدا تو سن رہا ہے، جبکہ عزت اور ذلت خدا ہی کی قدرت میں ہے۔

۱۵۔ اگر کوئی ایسی گفتگو ہو رہی ہو جس میں آپ بھی شریک ہوں تو اس میں دلچسپی لیجیے۔

۱۶۔ اپنے بارے میں بہت زیادہ گفتگو مت کیجیے۔

۱۷۔ ضرورت کے موقع پر اپنے ساتھیوں سے مشورہ طلب کر لیجیے۔ اس انداز سے انھیں اپنی اہمیت کا اندازہ ہوگا، وہ آپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے، اور خوش دلی کے ساتھ آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔

۱۸۔ لوگوں کے نام یاد رکھیے اور انھیں اچھے ناموں سے پکاریے۔

۱۹۔ دوسروں کی امداد کے لیے ہروقت آمادہ رہیے۔

۲۰۔ اپنے اندر جوش و امنگ برقرار رکھیے۔ اپنے تمام امور کو توازن کے ساتھ سرانجام دیجیے۔

۲۱۔ اپنی شخصیت سے ان خامیوں کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کیجیے:

(۱) خود غرضی۔ (۲) لباس اور ظاہری حالت سے لاپرواہی۔ (۳) خود پسندی۔ (۴) مایوسی۔ (۵) سب سے علیحدگی۔ (۶) جھوٹی شیخی۔ (۷) لاپرواہی۔ (۸) بے وفائی۔ (۹) بدمزاجی۔ (۱۰) بے اطمینانی اور (۱۱) کام سے گھبراہٹ۔

۲۲۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہیے کہ "اے اللہ، لوگوں کے دلوں میں میرے لیے عزت اور محبت پیدا کر دے۔ مجھے اپنی نظروں میں چھوٹا اور لوگوں کی نظروں میں بڑا بنا دے۔ میرے ظاہر کو اچھا اور شائستہ کر دے، اور میرے باطن کو میرے ظاہر سے اچھا کر دے۔"

ج۔ چند دیگر امور

لیڈر بننے کے لیے ڈاکٹر ہربرٹ کاسن نے چند مشورے دیے ہیں:

۱۔ مناسب غور و فکر ضرور کیجیے، مگر فیصلوں پر پہنچنے کے عادی بنیں۔

۲۔ ہمیشہ رائے آزادی کے ساتھ قائم کریں۔ غیر ضروری طور پر اپنی آزادی کو دوسروں کی قید میں نہ ڈالیں۔

۳۔ خوب سوچنے اور سمجھنے کے بعد جو رائے قائم کریں، اس پر ثابت قدم رہیں۔

۴۔ہمیشہ اپنی کوشش اور جدوجہد جاری رکھیں۔
۵۔شکست اور ناکامی کو زیادہ اہمیت نہ دیں 'بلکہ ان سے سبق سیکھیں۔
۶۔چونکہ آپ کو معاشرے میں کام کرنا ہے اور ان کو متاثر کرنا ہے' لہٰذا ایسے کام انجام دیں جن کی اہمیت لوگ جلد محسوس کریں۔
۷۔دوسرے راہ نماؤں کی دوستی اور تعاون حاصل کریں۔
۸۔اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے خطرات کی پرواہ نہ کریں۔
۹۔اپنے پیچھے چلنے والوں کی کارکردگی اور وفاداری کا کچھ صلہ اور انعام ضرور دیں۔خواہ تعریف کے چند الفاظ ہی ہوں۔

چند ماہرین نے ایک اور نقطہ نظر سے قائدانہ صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے جو تجاویز دی ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔اپنی آنکھوں کی قوت کے ذریعے اپنے اندر بصیرت 'مشاہدہ اور پیش بینی کی قوتوں کو بڑھایئے۔
۲۔اپنی سوچ کی قوت کے ذریعے یاد کرنے اور رکھنے 'تجزیہ کرنے اور تخلیقی امور سرانجام دینے کی کوشش کیجیے۔
۳۔اپنی قوت عمل کے ذریعے تقسیم کار' تربیت کار اور نگرانی کار کی صلاحیتوں کو اجاگر کیجیے۔
۴۔اپنی منصوبہ بندی 'تنظیم اور تفویض کی صلاحیتوں کو بڑھایئے۔ٹیم ورک کا فن سیکھیے۔
۵۔کام کرنے کے سلسلے میں لوگوں کو ہدایت دیجیے۔ہدایت دینا 'قیادت کی بنیادی خصوصیت ہے۔لوگوں میں ہدایت پر عمل کروانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے ان سے اچھے تعلقات ہوں۔ جو ہدایت آپ جاری کریں 'ابتداً کچھ عمل خود بھی کر کے دکھائیں تاکہ لوگوں میں کام کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔حکمت کے ساتھ تنظیم کا ڈھانچہ بنائیں' تقسیم کار کریں 'لوگوں کو اپنی ذمہ داریوں کا علم' احساس اور جواب دہی کا طریقہ معلوم ہو۔
۶۔اپنے ماتحت افراد کو ایسی تعلیم دیجیے کہ ان کا زاویہ نگاہ وسیع ہو' اور وہ اپنے خول سے باہر آکر عظیم تر مقاصد کے لیے کام کریں۔
۷۔لوگوں کے اجتماعی مفادات کی ان کی توقعات کے مطابق نمایندگی کرتے رہیے۔

قیادت/ لیڈرشپ کے لوازم اور شرائط

درج ذیل اشارات کا زیادہ تر تعلق اہل منصب سے ہے۔اس سلسلے میں تفصیلی گفتگو کی بجائے علما و ماہرین کے بتائے ہوئے اصولوں کے اشارات تحریر کیے گئے ہیں۔

اہل علم کہتے ہیں کہ ہم اس وقت تک دوسرے لوگوں کی راہ نمائی کی توقع نہیں رکھ سکتے جب تک کہ خود اپنے آپ پر حکومت کرنے اور اپنی راہ نمائی کرنے کا طریقہ نہ سیکھ لیں۔

علامہ ماوردی قیادت کے لیے درج ذیل شرائط بتاتے ہیں: حق پژوہی، علم، اہلیت اجتہاد، صحت حواس و نطق، عقل و فراست، شجاعت اور دلیری، عمدہ یادداشت، حقائق کی تہہ تک جلد پہنچنے کی صلاحیت، مافی الضمیر کی ادائیگی کی طاقت، لہو ولعب سے پرہیز، کھانے پینے کی زیادہ خواہش کی عدم موجودگی، عیاشی سے دوری، سچائی سے محبت اور جھوٹ سے نفرت، فراخی قلب، انصاف کی محبت، استبداد اور ظلم سے نفرت، عدل گستری کی طاقت، ادائیگی فرض میں بے خوفی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حکومت کرنے کا سزاوار نہیں مگر ایسا شخص جس میں یہ چار اوصاف پائے جاتے ہوں:

۱- نرمی ہو--- لیکن کمزوری نہ ہو۔
۲- مضبوطی ہو--- لیکن سختی نہ ہو۔
۳- کم خرچی ہو لیکن بخل نہ ہو، اور
۴- سخاوت ہو لیکن اسراف نہ ہو۔

تنبیہات

حضرت معقل بن یسار نے (بنو امیہ کے گورنر) عبید اللہ سے فرمایا کہ میں تمھیں ایک حدیث سناتا ہوں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی۔ حضور نے فرمایا کہ جو شخص مسلمان رعیت کا حاکم ہو اور وہ اس حال میں مرجائے کہ اس رعیت کے ساتھ خیانت کر رہا ہو تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام کر دے گا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عبدالرحمن کبھی امارت کی طلب نہ کرو۔ اگر مانگنے سے ملے تو نفس کے پھندوں میں پھنس جاؤ گے اور بے طلب ملے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمھاری امداد ہو گی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک بار عمال کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے حکومت کے ذمہ دارو، لیڈر کی نرمی اور بردباری سے زیادہ نفع بخش اور خدا کے نزدیک زیادہ پسندیدہ اور کوئی بردباری نہیں ہے۔ اسی طرح لیڈر کی ناسمجھی اور جذباتیت اور بے سوچے سمجھے کام کرنے سے زیادہ نقصان دہ اور ناپسندیدہ کوئی دوسری نادانی نہیں۔ ایک حاکم کی عیش مزاجی سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو کسی کی عیش مزاجی اور جہالت ناپسند نہیں ہے۔

آخری بات

ایک صاحب اپنے گھر میں مطالعہ کر رہے تھے ۔ ان کا پانچ چھ سال کا بچہ بار بار پریشان کر رہا تھا۔ صاحب نے کئی بار کوشش کی کہ وہ مطالعہ کے دوران تکلیف نہ دے مگر بچہ ماننے والا کہاں تھا۔ صاحب کو ایک ترکیب سوجھی ۔ اپنے بیٹے کو مصروف رکھنے کی ترکیب ۔ تاکہ بچہ چند گھنٹے تک اپنے والد صاحب کو پریشان نہ کر سکے ۔ ترکیب یہ تھی کہ صاحب نے قریب سے اخبار اٹھایا ۔ اس پر دنیا کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ انھوں نے یہ نقشہ لیا اور بیٹے کو بتایا کہ یہاں پر پاکستان ہے ' یہاں ہمالیہ ' یہاں بحرالکاہل اور یہاں امریکہ ۔ یہ سب بتانے کے بعد صاحب نے نقشے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور بیٹے سے کہا کہ اب وہ اسے صحیح طرح ترتیب کے ساتھ بنا کر لائے ۔ صاحب کو توقع تھی کہ بیٹا چند گھنٹے لگائے گا اور پھر آئے گا ۔ یا پھر ممکن ہے وہ نقشے کو دوبارہ بنا ہی نہ سکے ۔ ابھی کوئی آدھ گھنٹہ ہی ہوا کہ بچہ خوشی سے دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا: ابو! ابو! دنیا کا نقشہ ٹھیک ہو گیا ۔ ابو جان نے دیکھا ۔ ہر چیز اور ہر مقام اپنی جگہ ٹھیک ٹھیک موجود تھا ۔ بیٹے کی ذہانت پر تعجب ہوا اور پوچھا بیٹے یہ کیسے ممکن ہوا؟ بیٹے نے جواب دیا' وہ جواب ہم سب کے لیے اہم ہے ۔ جواب تھا: ابو! جب آپ نقشہ پھاڑ رہے تھے تو اس وقت میں نے دیکھا کہ اس کے پیچھے آدمی کی اتنی ہی تصویر تھی ۔ بس میں نے اس تصویر کو ٹھیک کر لیا ۔ دنیا کا نقشہ خود بخود ٹھیک ہو گیا۔

ہمیں اس دنیا کا نقشہ ٹھیک کرنا ہے ' آیئے پہلے اپنی تصویر (اپنے آپ کو) ٹھیک کرتے ہیں۔

اخبار امت

بوسنیا کا بحران کدھر؟

مسلم سجاد

سرب ٹیلی ویژن نے اقوام متحدہ کی امن فوج کے سپاہی کے ہاتھ میں ہتھکڑی دکھائی اور اخبارات و رسائل نے اس کی تصویر ساری دنیا میں دکھا دی۔ وہی اقوام متحدہ جو جارحیت کی سزا دینے کا نعرہ بلند کرتی ہوئی امریکہ کی سرپرستی میں عراق پر چڑھ دوڑی تھی، اور مژدہ سنایا گیا تھا کہ اب آنے والی نئی دنیا کے دور میں کوئی ملک کسی پر چڑھائی کی جرات نہیں کرے گا، بوسنیا کی آزاد مملکت پر سرب جارحیت کے آگے بے دست و پا ہے۔ سرب اس کی ہر ممکن تذلیل و تحقیر کر رہے ہیں۔ امریکہ، ناٹو، برطانیہ، فرانس، کوئی بھی اس کی عزت بچانے کو آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔ ایف-۱۶ کا گرایا جانا، ۳ سو سے زائد فوجیوں کو یرغمال بنانا اور زنجیروں میں باندھ کر بمباری کے آگے انسانی ڈھال بنانا، یہ تو تازہ واقعات ہیں جو ایک عیسائی یورپین ملک میں ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک بھی مسلمان ملک سے سرزد ہو جاتا تو دہشت گردی کے الزام میں مغربی فوجیں فوراً سزا دینے دوڑ پڑتیں۔

بوسنیا کی صورت حال تین سال گزار کر آج اس موڑ پر پہنچ گئی ہے کہ کھیل کے سب اداکاروں کے ملمع اتر گئے ہیں، اور ان کے حقیقی چہرے سامنے آگئے ہیں۔ کھیل شروع کرنے والوں کو کھیل کے اتنے طویل عرصے تک کھنچ جانے کا (یعنی مسلمانوں کی اتنی سخت جانی کا) اندازہ نہ تھا۔ کھیل ختم ہو جاتا تو کرداروں پر لیپا پوتی کر کے اگلی مہم کو ہاتھ میں لیا جاتا۔ لیکن اس میں پھنس جانے سے سب کو سب کچھ صاف نظر آرہا ہے۔ مغربی دنیا کے بعض روشن ضمیر اہل قلم اپنی حکومتوں کو شرم بھی دلا رہے ہیں (ان کا ضمیر کم سے کم ہمارے مسلمان حکمرانوں سے زیادہ جان دار ہے)۔

سابق یوگوسلاویہ کے خاتمے کے بعد ہتھیاروں پر پابندی ایک ظالمانہ اور غیر منصفانہ اقدام تھا جسے آج تک برقرار رکھا گیا ہے۔ سربوں کو دنیا کی چوتھی بڑی فوج کے سب ہتھیار اور اسلحے اور

کارخانے ملے اور بوسنیا کے مسلمانوں کو بچے کھچے پر گزارا کرنا پڑا۔ اس کی وجہ کھلے عام یہ بتائی گئی کہ اگر بوسنیا کو ہتھیار دیے گئے تو جنگ طول کھینچ جائے گی (یعنی سربوں کی فتح میں دیر ہو گی)۔ اقوام متحدہ کے چارٹر اور بین الاقوامی قوانین کے تحت کوئی بھی ملک بوسنیا کی امداد کو آسکتا تھا۔ مسلم ممالک کا تو فرض تھا، لیکن اقوام متحدہ کی عائد کردہ پابندی کے احترام میں او آئی سی نے یہ جرات نہ کی۔ اگر سب مسلم ممالک امبارگو توڑ کر بوسنیا کو اسلحہ پہنچاتے تو آیندہ ان کی دھمکی میں کچھ وزن پیدا ہو جاتا۔

اس صورت حال میں، جب کہ سربوں کی کھلی حمایت کرنے کے لیے روس، اور درپردہ ان کے مفادات کی تکمیل کے لیے برطانیہ، فرانس اور امریکہ مصروف تھے، بوسنیا کے مسلمانوں نے ہر طرح کے ظلم و ستم سہہ کر اور قربانیاں دے کر، اپنی آزادی کا دفاع کیا۔ ان کا ۷۰ فی صد علاقہ سربوں کے قبضے میں چلا گیا لیکن انھوں نے گھٹنے نہ ٹیکے۔ محفوظ علاقے قرار دیے جانے اور امن فوج آنے کے باوجود، سربوں کے حملے اور اقوام متحدہ کی خلاف ورزیاں بلکہ تضحیک معمولاً جاری رہیں، مگر مظلوموں کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ ایک امن منصوبہ جس کے تحت بوسنیا کو اپنی حدود کا صرف ۵۰ فی صد ملتا ہے، مغربی دباؤ کے تحت بوسنیا کی حکومت منظور کر چکی ہے، لیکن عظیم تر سربیا کا خواب دیکھنے والے بوسنیائی سربوں کے لیڈر کراوزچ اور سربیا کے صدر میلا سووچ اسے منظور کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس لیے کہ انھیں اپنے پشتی بانوں پر اعتماد ہے کہ وہ ان کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے اور ان کی منہ مانگی مراد پوری کریں گے۔

یرغمالی بنائے جانے کے بعد برطانیہ اور فرانس نے اعلانات کیے کہ وہ تین ہزار مزید افواج بھیجیں گے۔ لیکن یہ بحث جاری ہے کہ کس لیے؟ سربوں کو سزا دینے کا تو تصور بھی نہیں ہے۔ بوسنیا کے محفوظ علاقوں کی حفاظت بھی مقصود نہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنی فوجوں کو بہ حفاظت نکال لے جانے کے لیے یہ فوج تیار ہو رہی ہے۔ اور اب تو اقوام متحدہ کی فوج کو ہر جوابی کارروائی سے روک دیا گیا ہے۔ چنانچہ کھانا پہنچانے جو آئے تھے، ان کو سرائیوو کے محصور مسلمان جان پر کھیل کے کھانا پہنچا رہے ہیں۔ حفاظت کرنے جو آئے تھے، ان کی اپنی حفاظت کا مسئلہ ہے۔

امریکہ جس نے اب تک کوئی فوجی امن فوج میں نہیں دیا ہے، ایف۔۱۶ کے گرائے جانے کے بعد وہ اپنے پائلٹ کے تحفظ کے لیے پریشان ہے۔ صومالیہ کے ڈراؤنے خواب نظر آ رہے ہیں۔ سربوں کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ اب ناٹو کے جہاز بمباری کرنے نہیں آئیں گے۔ جہاز گرائے جانے پر صدر کلنٹن نے بہت ملفوف الفاظ میں فوج بھیجنے کا ذکر کیا تو خود امریکہ میں شور مچ گیا، ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر تقریباً اسے واپس لے لیا گیا۔ ڈپٹی سکریٹری آف اسٹیٹ نے خفیہ طور پر پیرس پہنچ کر ناٹو کے ممالک کو بتایا کہ کہیں وہ واقعی امریکی فوج کی شرکت کی توقع نہ کر لیں۔ امریکہ کی یقین دہانی بس اتنی ہے کہ امن

فوج کی واپسی پر تحفظ فراہم کرنے کے لیے اپنی افواج مہیا کرے گا۔

اب تو دو حل نظر آ رہے ہیں ایک یہ کہ مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور ایمبارگو ہٹا دیا جائے۔ مسلمانوں کا قتل عام ہو گا تو کوئی بات نہیں۔ مگر یہ اندیشہ قدم روک رہا ہے کہ کہیں بازی پلٹ نہ جائے اور بوسنیا کے مسلمان غالب نہ آ جائیں۔ دوسرا یہ کہ سربیا کے صدر صاحب کے آگے ہاتھ پاؤں جوڑے جائیں کہ وہ بوسنیا کی حدود کو تسلیم کریں، یرغمالی واپس دلوا دیں، اپنے شاگرد کرادزچ سے منصوبہ امن منظور کروا دیں اس کے صلے میں سربیا پر عائد اقتصادی پابندیاں اٹھا لی جائیں۔ بوسنیا کے صدر عزت بیگووچ نے یہی کہا ہے کہ یرغمالی اس لیے بنائے گئے ہیں کہ ان کو چھوڑنے کے عوض اقتصادی پابندیاں ہٹالی جائیں۔

مغرب کا بڑا دعویٰ ہے کہ اس کی سیاست میں مذہب کا دخل نہیں ہے، اس کی تہذیب نے انسان کو بحیثیت انسان وقعت اور وقار دیا ہے۔ چند لمحات کے لیے یہ تصور کریں کہ سرب مسلمان ہوتے اور بوسنیا کے شہری عیسائی، تو بوسنیا کے مسئلہ کی شکل کیا ہوتی! اقوام متحدہ کا کردار کیا ہوتا، برطانیہ اور فرانس کے سفارت کار کیا معاہدہ کرواتے، رابطہ گروپ کی کیا کارکردگی ہوتی۔ پھر تو یقیناً جارح کو سزا دی جاتی اور اخلاقی اصولوں کی برتری ثابت کی جاتی۔

ایک مغربی نامہ نگار کے الفاظ میں: سرائیوو کی پہاڑیوں پر بیٹھا سرب فوجی شہر کی گلیوں میں ادھر سے ادھر جانے والوں کو جب شکار کرتا ہے تو وہ انھیں ترک کہتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ یہ ۱۵۲۹ ہے، اور وہ وی آنا کے دروازوں پر سلیمان اعظم کو روک رہا ہے (نیوز ویک، ۱۲ جون ص ۳۲)۔ سرب فوجی ہی نہیں، سب مغربی طاقتوں کا یہی نقطہ نظر محسوس ہوتا ہے۔ تجزیہ نگار کہہ رہے ہیں کہ مغربی طاقتوں میں سیاسی عزم نہیں ہے، سرب سنجیدہ ہیں، ناٹو سنجیدہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ طاقتیں ناسمجھ اور سادہ لوح تو نہیں۔ سب سوچی سمجھی پالیسی ہے۔ یورپ کے قلب میں آزاد مسلم مملکت کا وجود گوارا نہیں ہے۔

یہی بوسنیا کے مسئلہ کی حقیقت اور کلید ہے۔ اس کا ادراک احیائے اسلام کی قوتوں کو تو ہے جن کی جہادی تنظیموں نے بوسنیا کی ممکنہ امداد کی ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ مسلم ممالک کے حکمرانوں نے، جن کے ہاتھوں میں امت کے ذرائع وسائل ہیں، مصلحتوں اور مفادات سے اپنے ہاتھ پاؤں باندھ لیے ہیں بلکہ زبانیں بھی سی لی ہیں۔ انھوں نے یہ مسئلہ مغرب کے حوالے کر دیا ہے۔ اگر وہ مثبت کردار ادا کرتے، اپنا وزن حکمت کے ساتھ استعمال کرتے، تو شاید افواج بھیجنے کی نوبت نہ آتی، اور بوسنیا کا مسئلہ اتنی خون ریزی کے بغیر کسی شکل میں حل ہو جاتا۔

بوسنیا میں اقوام متحدہ، ناٹو، مغربی اور مسلم ممالک کے کردار نے چیچنیا کے مسئلے پر روس کی کھلی

حوصلہ افزائی کی ہے۔اسے اطمینان ہے کہ وہ کچھ بھی ظلم کرلے 'مسلمان حکومتیں آواز تک نہیں اٹھائیں گی ' اور مغربی دنیا تو مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے میں شریک و حلیف ہے ہی۔ (چیچنیا میں بھی یہی شکایت ہے کہ اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے)۔بھارت کو اطمینان ملا ہے (اگر کچھ کم تھا) کہ وہ کشمیر میں کچھ بھی کرلے 'انسانی حقوق کے علمبردار عملاً کچھ نہیں کریں گے۔اسرائیل کو تو پہلے ہی سے اندازہ ہے۔

افسوس ہے تو مسلمان حکمرانوں پر۔وہ جس امریکہ کے آگے ہاتھ باندھے رہتے ہیں' وہ کسی اعلیٰ مقصد کے لیے اپنے ایک فوجی کی جان کا نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔اس کی قوت کی حقیقت دام ہے۔ امت کی بد نصیبی ہے کہ یہ حکمراں اپنی تقدیر اپنے ہاتھ میں لینے کے بجائے 'اس کمزور دشمن کے دباؤ کا شکار ہیں۔اور اس حد تک ہیں کہ اس کے مفادات پورا کرنے کے لیے ملک اور قوم و ملت کے مفادات داؤ پر لگانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

حالانکہ ۸' ۱ بڑے ممالک ہی عزم اور ارادہ کے ساتھ اقدامات کریں تو مسلمانوں کو عزت و وقار نصیب ہو سکتا ہے اور ان کا خون اتنا ارزاں نہ رہے۔مغرب کے عیسائی ممالک مستقبل کے حوالے سے غور و فکر کر کے حکمت عملی 'غلط یا صحیح ' اپنا رہے ہیں۔امت مسلمہ کے حکمرانوں اور راہ نماؤں کو مسلمانوں کے مستقبل کے حوالے سے حکمت عملی اختیار کرنا چاہیے۔اگر حکمران مغرب کے تابع اور آلہ کار ہیں تو انھیں تبدیل کرنے کے لیے مسلمان عوام کو آگے آنا چاہیے۔

ملائیشیا ــــ مستقبل کے امکانات

حافظ محمد ادریس

ملائیشیا کی پارلیمنٹ کے حالیہ انتخابات (اپریل ۹۵) میں وزیر اعظم مہاتر محمد اور ان کی پارٹی امنو (UMNO) 'یعنی یونائیٹڈ مالے نیشنل آرگنائزیشن نے نیشنل فرنٹ بنا کر ' ۱۹۲ کے ہاؤس میں ۱۶۲ سیٹیں جیت لیں اور شاندار کامیابی حاصل کی 'جبکہ سابقہ پارلیمنٹ میں ان کے پاس ۱۸۰ میں سے ۱۲۷ نشستیں تھیں۔ادھر 'اپوزیشن کی سیٹیں ۵۳ کے مقابلے میں ۳۰ رہ گئی ہیں۔امنو کے ووٹوں کی تعداد ۵۳ سے بڑھ کر ۶۳ فیصد ہوگئی ہے 'اور سیٹوں کی تعداد ۷۱ سے بڑھ کر ۸۴ فی صد۔

ملائیشیا کے انتخابات اس لیے اہم ہیں کہ جنوب مشرقی ایشیا میں واقع یہ ملک ایشیا اور اسلامی ممالک میں ایک منفرد مقام کا حامل ہے۔اس میں شروع سے آج تک جمہوری حکومت قائم ہے۔اسے یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ برادر اسلامی ممالک میں یہی واحد ملک ہے جو صنعت و معیشت کے میدان میں ترقی یافتہ ممالک کا مقابلہ کر سکتا ہے۔باقی چند مسلم ممالک محض پیٹرو ڈالر کی وجہ سے بہتر معاشی

حالات کا لطف اٹھا رہے ہیں' جبکہ پاکستان اور ترکی صنعتی و معاشی بحران کا شکار ہیں۔

ملائیشیا کی تقریباً دو کروڑ کی آبادی میں مسلم تناسب ۵۲ ' ۴۴ فیصد ہے جو سب ملائی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ باقی ۴۶ ' ۴۶ فیصد آبادی چینی 'ہندی اور دیگر قومیتوں' اور مذہبی لحاظ سے بدھ 'ہندو' کنفیوشس 'تائی' عیسائی اور سکھ مذاہب پر مشتمل ہے۔ ملائیشیا ایک وفاقی ملک ہے۔ وفاق میں ۱۳ ریاستیں شامل ہیں۔ ملائیشیا استعمار سے مکمل طور پر ۱۹۵۷ میں آزاد ہوا۔ ملک کی منتخب پارلیمنٹ ہر پانچ سال بعد چنی جاتی ہے' جس کے لیے برطانوی طریق انتخاب 'یعنی ایک حلقہ ایک ممبر کی بنیاد' رائج ہے۔

آبادی میں ملائی مسلمانوں کے کم تناسب کی وجہ سے 'امنو نے آزادی کے وقت ہی سنگاپور کو الگ کر کے چینی پارٹیوں کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کی حکمت عملی اختیار کی' اور ۱۹۵۷ سے وہی مسلسل برسر اقتدار ہے۔ ۷۰ سالہ ڈاکٹر مہاثر محمد بھی ۱۹۸۱ سے برسراقتدار ہیں۔ انھوں نے جان میجر کی ملائیشیا آمد پر بوسنیا کے مسئلے پر مغرب کو کھری کھری سنا کر' اور ایک برطانوی اخبار کی جانب سے رشوت کا الزام لگائے جانے پر تجارتی معاہدے نہ کرنے کی پالیسی کا اعلان کر کے مسلم دنیا میں ایک مقام حاصل کر لیا ہے۔

ملائیشیا میں پارٹی کے اندر ہی پرامن انتقال اقتدار کی صحت مند روایات ہیں۔ گذشتہ برس سے مہاثر کے جانشین کے طور پر نائب وزیر اعظم انور ابراہیم کا نام لیا جا رہا ہے۔ انوار ابراہیم ایک طالب علم کے طور پر تحریک اسلامی کے ہونہار کارکن تھے۔ آبیم (ABIM) ملائیشیا کے اسلام پسند نوجوانوں کی نہایت منظم اور موثر تنظیم تھی۔ انوار کا ستارہ اسی پلیٹ فارم سے چمکا' اور جب وہ کسی قابل ہوئے تو انھوں نے ایک نئی حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے 'امنو میں شرکت کر لی' اور جلد نائب وزیر اعظم کے عہدہ پر پہنچ گئے۔ لیکن اب بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دونوں کے درمیان اختلافات پیدا ہو چکے ہیں۔

نیشنل فرنٹ کی شاندار کامیابی اپنی جگہ 'مگر اس میں شک نہیں کہ مہاثر کی حکومت نے مختلف قانونی اور عدالتی اقدامات سے اب انتخابات کو تقریباً یک طرفہ کھیل بنا دیا ہے۔ دوسری طرف حکمران ٹولے کے بہت سے ارکان بدعنوانی اور غیر اخلاقی حرکات کے مرتکب ہوتے رہے ہیں۔ سرکاری وسائل اور خصوصاً ذرائع ابلاغ کا جانبدارانہ اور یک طرفہ استعمال بھی حکوت نے بے تحاشا کیا۔ حکمران طبقے کی بدعنوانیوں کے تذکرے جگہ جگہ ہو رہے تھے اور بعض افراد کے خلاف عدالتوں میں مقدمات بھی تھے۔ تاہم اپوزیشن اس صورت حال کو یا تو حکمت اور موثر منصوبہ بندی سے استعمال نہیں کر سکی 'یا عام رائے دہندگان ترقی اور خوشحالی کے جادو سے اس قدر مسحور تھے کہ انھوں نے اس جانب سے بالکل آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

بعض تبصرہ نگاروں کی یہ رائے کہ حالیہ انتخابی نتائج سے ملائیشیا کے عوام کا رجحان یک جماعتی نظام کے حق میں تبدیل ہو رہا ہے، صحیح محسوس نہیں ہوتی۔ ملائیشیا اب تک مسلسل جمہوریت کے راستے پر چل رہا ہے۔ اس بات کا امکان ہے کہ اپوزیشن پارٹیاں کچھ مشترک امور پر آپس میں اتحاد کر لیں۔ اس کے علاوہ امنو کے اندر بھی مختلف فکری دھڑے موجود ہیں۔ دیر یا سویر ان کے درمیان اختلافات پیدا ہو سکتے ہیں اور یوں ایک سے دو یا زیادہ سیاسی پارٹیاں وجود میں آ سکتی ہیں۔ کسی وقت حمزہ رضا علی کی پارٹی ایس ۴۶ بھی امنو ہی سے الگ ہوئی تھی۔ چینی آبادی سے تعلق رکھنے والی سیاسی تنظیمیں مثلاً ملائیشین چائنیز ایسوسی ایشن، جو اس وقت مہاتر کے ساتھ فرنٹ میں شامل ہیں کسی موقع پر اپنا راستہ الگ کر سکتی ہیں۔

اسلامک پارٹی ایسی جماعت ہے جس نے پارلیمنٹ میں اپنی ۷ نشستوں کی سابقہ پوزیشن بحال رکھی ہے۔ ان کے صدر، استاذ فاضل نور نے قدح سٹیٹ اسمبلی میں اپنی نشست برقرار رکھی جبکہ پارٹی کے نائب صدر شیخ عبدالہادی اونگ، ترنگانو سے پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلی میں بیک وقت کامیاب قرار پائے۔ حکمران پارٹی اسلامک پارٹی کے مضبوط قلعے ریاست کلنتان کو فتح کرنے میں ناکام رہی۔ یہاں کی ۴۳ ریاستی نشستوں میں اسلامک پارٹی نے ۲۴ اور اس کی اتحادی جماعت ایس ۴۶ نے ۱۱ پر کامیابی حاصل کر کے اپنی اکثریت بھی بحال رکھی۔ البتہ اس مضبوط قلعے میں حکمران فرنٹ نے اس مرتبہ شگاف ضرور ڈال دیا ہے۔ گذشتہ انتخابات میں انھیں یہاں سے پارلیمنٹ اور ریاست کی کسی سیٹ پر کامیابی نہیں ملی تھی۔ اس مرتبہ اس نے ریاست میں ۸ اور پارلیمنٹ میں یہاں کی ۱۴ نشستوں میں سے ۲ حاصل کر لی ہیں۔ فار ایسٹرن اکنامک ریویو نے ملائیشیا کے انتخابات کے بعد اپنی ۱۸ مئی کی اشاعت میں یہ انکشاف کیا ہے کہ کلنتان میں اسلامک پارٹی کی کامیابی سے حکومت خاصی پریشان ہے۔ اسلامک پارٹی کے خلاف ایک کیس تیار کیا جا رہا ہے، جس میں اس پر الزام ہے کہ اس نے لوگوں کے مذہبی جذبات کو انتخابات میں بر انگیخت کیا۔

ملائیشیا صنعتی و تجارتی میدان میں جس رفتار سے ترقی کر رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ خطے کے دیگر صنعتی ممالک جاپان، کوریا اور تائیوان کے لیے یہ ایک چیلنج بن جائے گا۔ کچھ بعید نہیں کہ یہ ان سب سے آگے نکل جائے۔ مہاتر کی شخصیت، انور ابراہیم کے وزیر اعظم بننے کے امکانات، ملائیشیا کی آبادی میں گہرے اسلامی اثرات، مغرب میں تعلیم یافتہ طلبہ کی بھاری تعداد کی اسلامی تحریک میں شرکت اور پھر ملائیشیا کا سیاسی استحکام اور معاشی ترقی، یہ سب مستقبل کے لیے دلچسپ اور خوش آیند امکانات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

اسلام اور جمہوریت: ایک تصادم؟

پروفیسر ولیم زارٹ مین کے ساتھ ایک مکالمہ

اخذ و تلخیص : مسلم سجاد

''اسلام اور جمہوریت'' کے اہم مسئلے پر ہم اس سے قبل دو تحریریں (۱۔ مغرب کے خلاف مسلمانوں کا غیظ و غضب، ستمبر ۹۴ ، ۲۔ اسلام اور مغرب، اکتوبر ۹۴) شائع کر چکے ہیں، جو مغرب کے نقطہ نظر کی ترجمان تھیں۔ آج ہم جان ہاپ کنس یونی ورسٹی کے پروفیسر زارٹ مین کی ایک تحریر کی تلخیص، ایک مکالمہ کی صورت میں شائع کر رہے ہیں، تاکہ قارئین کے سامنے ہمارے نزدیک جو اسلام کا نقطہ نظر ہے وہ بھی ساتھ ساتھ آتا جائے۔

مغرب، جمہوریت کو انسانی تاریخ میں اپنا کارنامہ قرار دیتا ہے، اور دنیا بھر میں اس کے فروغ کا علم بردار ہے، لیکن مسلم ممالک کے لیے نہیں۔ اس لیے کہ بظاہر انھیں بڑی تشویش ہے کہ اگر یہاں احیائے اسلام کی قوتیں، جمہوری ذرائع سے سہی، ایک دفعہ بر سر اقتدار آگئیں تو پھر وہ کبھی اقتدار نہیں چھوڑیں گی اور جمہوریت کے بجائے آمریت کی راہ پر چلیں گی۔ عملی صورت حال یہ ہے کہ تقریباً نصف صدی سے بر سر اقتدار، ان کی جانشین، سیکولر ''جمہوری'' پارٹیاں بدترین آمریت اور استبداد کی راہ پر گامزن ہیں، اور ان پارٹیوں کے حق میں دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں جن کے حق میں اکثریت کا ہونا متفق علیہ ہے۔ مگر مغرب کے حکمران، نہایت ڈھٹائی سے ان نااہل، کرپٹ، عوام کی حمایت سے محروم اور کسی غیر جانبدار انتخاب میں یقینی شکست سے دوچار حکمرانوں کو مسلط رکھنے میں انھیں ہر طرح کی حمایت فراہم کر رہے ہیں، اور ان کے دانش ور اس دوغلی منافقانہ روش کے لیے سند جواز فراہم کر رہے ہیں۔ یوں وہ جمہوریت سے اپنی ''وفاداری'' ثابت کر رہے ہیں۔ الجیریا اس کی ایک کھلی مثال ہے۔ اس پس منظر میں یہ تحریر بڑی دلچسپ نظر آتی ہے۔ (مدیر)

زارٹ مین: آج دنیا کا بڑا حصہ دو تاریخی سیاسی دھاروں کے درمیان کشمکش کا شکار ہے، ایک جمہوریت کا اور دوسرا سیاسی اسلام کا۔ مکمل فتح کسی کی بھی نہیں ہوگی، مگر اس کشمکش کا نتیجہ لوگوں کے

لیے 'اور باقی دنیا کے لیے بھی 'بہت دور رس ثابت ہو گا۔

مدیر: یہ صورت حال کی صحیح تعبیر نہیں۔ معرکہ ہے 'مگر سیاسی اسلام اور جمہوریت کے درمیان نہیں دو تہذیبوں کے درمیان ہے: ایک خدا پرست تہذیب' جو ساری انسانی زندگی کی تشکیل 'بہ شمول سیاست کے 'وحی الٰہی کے مطابق کرنا چاہتی ہے' دوسری بے خدا تہذیب جو اجتماعی زندگی سے خدا اور اس کی ہدایت کو بے دخل کر چکی ہے۔ سیاسی اسلام ایک غلط اور من گھڑت اصطلاح ہے' اس لیے کہ بغیر سیاست کے اسلام' اسلام نہیں۔ اور جمہوریت تو 'اس معرکے میں بحیثیت ایک فریق کے 'ایک بالکل بے معنی اصطلاح ہے' اس لیے کہ جمہوریت کی اتنی ہی تعریفیں اور شکلیں ہیں جتنے اس کے دعوے دار ہیں۔ امریکہ کو بھی جمہوریت کا دعویٰ ہے' روس کو بھی تھا' جہاں ایک پارٹی کی حکومت تھی' اور پاکستان تو اسلامی جمہوریہ ہے ہی۔

ز: صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف جمہوریت کا نعرہ مقبول ہو گیا ہے' دوسری طرف لادینی سوشلزم اور تجدد modernization میں ناکامی کے ردعمل میں اسلام کا احیا اور اس کی سیاسی جدوجہد سامنے آگئی ہے۔

م: مغرب کا ہر تجزیہ نگار اس شدید غلط فہمی کا شکار ہے کہ احیاے اسلام کی تحریک معاشی' سیاسی اور تمدنی ناکامیوں کا ردعمل ہے۔ بدقسمتی سے وہ ہر وقوعے کی توجیہ صرف انھی مادی پیمانوں سے کرنا جانتا ہے۔ پھر جب انقلاب ایران جیسا واقعہ ہو جاتا ہے' تو حیران و ششدر رکھڑا رہ جاتا ہے۔ ورنہ اس تحریک کی جڑیں تو بڑی گہری' مسلمان کے قلب و روح اور دین و ایمان میں اتری ہوئی ہیں' اور ایک تاریخی تسلسل کے ساتھ' کامیاب اور خوش حال مسلمان حکمرانوں اور معاشروں میں اسلام سے انحراف کی اصلاح کے لیے برپا ہوتی رہی ہیں۔

ز: جب تقویٰ کو سیاسی نظام کی بنیاد بنایا جائے تو یہ امور مملکت اور بین الاقوامی تعلقات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے باوجود سعودی عرب اور پاکستان جیسے اسلامی مملکت کہلانے والے ملک مغرب سے تعاون کی راہ پر چل رہے ہیں' جبکہ ایران اور سوڈان مغرب سے تصادم کی راہ پر ہیں۔

م: اسی بات سے ظاہر ہے کہ معرکہ اسلام اور جمہوریت کے درمیان نہیں ہے۔ پاکستان' اللہ تعالیٰ کی حاکمیت تسلیم کرنے کے باوجود ایک جمہوریہ ہے' سعودی عرب ایک بادشاہت ہے' دونوں مغرب کے دوست ہی نہیں تابعدار ہیں۔

ز: درحقیقت فلسفے اور عمل کے لحاظ سے مغربی جمہوریت اور سیاسی اسلام دو جدا جدا نظام ہیں۔ ایک اسلامی ریاست میں کسی جمہوریت پسند کا کیا مقام ہے اور ایک جمہوری ریاست میں کسی اسلام پسند کا کیا مقام ہے؟ ایک اسلامی ریاست کتنی جمہوری ہو سکتی ہے اور ایک جمہوری ریاست کتنی اسلامی ہو سکتی ہے؟ یہ سوالات مسلم ممالک ہی میں نہیں' فرانس' انگلینڈ' انڈیا' رشین فیڈریشن اور امریکہ میں زیر بحث ہیں' اور حقیقی اور اہم ہیں۔

م: فلسفے کے لحاظ سے مغربی جمہوریت اور اسلام یقیناً دو مختلف بلکہ متصادم نظام ہیں - اس لیے کہ ایک عوام کی ' اور دوسرا خالق کائنات کی مطلق حاکمیت پر قائم ہے - لیکن ' حاکمیت الٰہی کی حدود میں ' امور اجتماعی ' بشمول امور ریاست ' کے چلانے کے لیے جمہوری عمل عین اسلام کے مطابق ہے - اسلام اور جمہوریت کا مسئلہ انھی کے ہاں شدت سے زیر بحث ہے جنھیں جمہوریت کے نتیجے میں اسلامی پارٹیوں کے بر سر اقتدار آنے اور مغرب کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے - علما اور علم برداران اسلام کے درمیان جمہوری عمل کی تفصیلات پر اختلافات ہو سکتے ہیں ' لیکن جمہوری عمل کے بارے میں کوئی بحث نہیں -

ز: مسلمانوں کے سامنے دو طرح کے ماڈل رہے ہیں - ایک ' وحی کی بنیاد پر زمین پر خدا کی سلطنت قائم کرنا ' اور دوسرا ' معاشرے میں مادی اقتدار کی بنیاد پر کامیابی اور خوشحالی لانا - دونوں کے درمیان کشمکش سے ایک جدلیاتی عمل وجود میں آتا ہے - اس عمل میں احیاے اسلام کا عنصر بھی داخل ہو جاتا ہے - مگر اس سہ گونہ جدلیاتی عمل میں نہ کسی کی فتح ہوتی ہے نہ شکست ' بلکہ دونوں نمونوں کے عناصر کے مجموعے سے ایک نیا نظام وجود میں آتا ہے - اس طرح یہ سلسلہ جاری رہا ہے -

م: افسوس ہے کہ آپ یہی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اسلام میں وحی کی بنیاد پر حکومت الہیہ اور مادی طور پر کامیاب اور خوش حال معاشرے کے درمیان سرے سے کوئی تصادم ہی نہیں کہ کسی جدلیاتی عمل کا سوال پیدا ہو - حکومت ' تجارت ' صنعت ' علم ' جنسی تعلق ' تفریح ' جنسی مذاق ' ہر چیز ایک نیکی ہے جب تک وہ حدود الٰہی سے متجاوز نہ ہو - دنیای زندگی ' حکم الٰہی کے مطابق ' بہتر سے بہتر بنانے ہی سے آخرت کا مقصود حاصل ہو سکتا ہے - یہ چرچ اور اسٹیٹ کی تفریق آپ کے سیکولرازم کی پیداوار ہے ' اس پیمانے پر اسلام کو نہ ناپیے -

ز: مغربی استعمار کی آمد سے مسلمانوں کے درمیان ایک نیا عنصر داخل ہوا - دوسری جنگ کے بعد قومیت اور اسلام کی قوت ' نو آبادیاتی حکومت کے خلاف مجتمع ہو کر کھڑی ہو گئی ' قومی اور جدید اصولوں پر مبنی ریاست قائم کرنے کے لیے آزادی حاصل کی گئی ' اور قیادت ان کے حصے میں آئی جو حاکموں سے ان کی زبان میں بات کر سکتے تھے - کچھ عرصہ گزرنے کے بعد یہ معاشرے بھی تنقید کی زد میں آ گئے - بورقیبہ ' سادات اور رضا پہلوی جیسے لادینی ' مغرب سے وابستہ ' مادیت پسند حکمران ' اپنے ملکوں میں کرپشن ' اخلاقی بحران ' قومی ورثہ سے غفلت ' اور ترقی کے نام پر معاشرے میں اکھاڑ پچھاڑ کے موجب بنے ' اور عوام کو وہ مادی فوائد بھی نہیں ملے جن کے دعوے کیے جاتے رہے - نتیجہ یہ ہے کہ معاشرے کی بنیادیں ہل گئی ہیں اور غربت اتنی عام ہو گئی ہے جتنی پہلے نہ تھی - جدیدیت اور اقتدار کے اس ناکام ملغوبے کے خلاف ردعمل اور محاذ آرائی کی زبان ' اسلام کی زبان ہے ' جو احیاے اسلام کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہے -

م: احیاے اسلام ایک ردعمل نہیں ' اپنی جگہ ایک مسلسل تاریخی عمل ہے ' یہ ہم واضح کر چکے ہیں - اس

سے انکار نہیں کہ ایک مرکب و مخلوط تہذیبی صورت حال میں کئی تاریخی اور مادی محرکات اور عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ لیکن ان سب کا رخ اسلام کی طرف اسی لیے پھرتا ہے کہ احیاے اسلام کا محرک ہی عوام کی تاریخ ' نفسیات ' روایات اور عقیدہ و ایمان میں اپنی مستقل جڑیں رکھتا ہے۔

ز: یہ ردعمل اور محاذ آرائی کوئی اتفاق نہیں ' اور نہ روز افزوں احیاے اسلام کوئی حادثہ ہے۔ جب بھی جاری نظام مشکلات کا شکار ہوتا ہے ' لوگ صرف اخروی نجات کے لیے نہیں ' بلکہ اس دنیا کی زندگی کو بہتر کرنے کے لیے بھی مذہب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جب لوگوں کو نو آبادیاتی دور کی سوشل سروسز بھی نہ فراہم ہو رہی ہوں تو وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کے احکامات پر عمل نہ کر کے اور اجنبی ماڈل اختیار کر کے وہ اس سزا کے مستحق ہو گئے ہیں۔ نجات اس میں ہے کہ خدا کے نازل کردہ سیدھے راستے پر چلیں۔

م: جب مغرب نے خدا کو کائنات میں تدبیر کے عمل سے اور حیات اجتماعی سے خارج کر دیا ' خواہ وہ ایک ذاتی معبود کے طور پر موجود ہو ' تو ہر کائناتی اور اجتماعی مظہر (phenomenon) کی توجیہ کے لیے اس کے پاس صرف مادی پیمانہ رہ گیا۔ لیکن اخلاقی پیمانے سے تو کسی کو بھی مفر نہیں۔ مقصد اور سمت کے فقدان ' ڈسپلن اور اخلاقی اقدار کے زوال سے معاشرہ انتشار کا شکار ہو سکتا ہے تو حکم الٰہی کی خلاف ورزی سے قومی زوال اور پستی کی توجیہ کیوں نہیں ہو سکتی؟

د: احیاے اسلام کا موجودہ مذہبی یوٹوپیا (مثالی معاشرہ) ملازمتیں فراہم کرنے اور مستعد اور دیانت دار حکومت کا اس بنیاد پر یقین دلاتا ہے کہ اس کا معاشی پروگرام قرآن میں ہے۔ اسی لیے اسے لازماً کامیاب ہونا ہے۔ اگر نہ ہو تو اس کی بھی توجیہ موجود ہے۔ وجہ پروگرام کی خامی نہیں ' بلکہ برائی کی ناپاک قوتوں کی طرف سے مزاحمت ہے۔ احیاے اسلام حالیہ نظام سے امتزاج نہیں ' بلکہ مکمل فتح چاہتا ہے۔

م: امتزاج کا مطلب اگر واضح ہدایات الٰہی کو ترک کر دینا ہے ' تو یقیناً اس کی کوئی گنجایش نہیں۔ لیکن اگر امتزاج کا مطالعہ رائج نظام و تہذیب کے ان مباح اور معروف پہلوؤں کو باقی رکھنا ہے جو مفید ہوں ' یا اجتہادی امور میں زمان و مکان کے لحاظ سے مطلوب تغیرات کے بارے میں غور کرنا ہے ' تو امتزاج ضرور ہو گا۔ غلط فہمی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ "پروگرام قرآن میں ہے" ' کو یا تو سمجھا نہیں جاتا ' یا اس کو دوسروں کو کنفیوز کرنے کے لیے غلط معانی پہنائے جاتے ہیں۔ پروگرام کا مطلب تمام تفصیلات نہیں ' بلکہ بنیادی اصول ہیں ' اور واضح احکام ہیں۔ یہ پروگرام ناکام ہو تو قرآن کی رو سے ' دوسروں پر الزام رکھنے کے بجائے صحیح روش اپنا جائزہ احتساب اور اصلاح ہے ' جس کا جامع عنوان استغفار ہے۔ قرآن نے استغفار پر مادی خوش حالی کا وعدہ منحصر کیا ہے۔

ز: جمہوریت ایک طرف 'ایک طریق کار ہے' حکمران منتخب کرنے کا۔ دوسری طرف یہ صرف ایک طریق کار نہیں 'ایک طرز حکومت بھی ہے جسے صرف ایسے جمہوری لوگ چلا سکتے ہیں جو بار بار انتخاب کا موقع دینے' اور ہارنے پر حکومت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار ہوں۔ خواندگی اور شہرکاری کے ساتھ' اس اصول کی پابندی جمہوریت کی کامیابی کے لیے لازمی ہے۔ لیکن جمہوریت کے تجربے کے بغیر اسے سیکھنا بھی ممکن نہیں۔ اس مشکل کا کیا حل ہو؟ یہ مشکل حل کرنے کے لیے' نو آبادیاتی استعمار نے اپنی رعایا کو تین طریقوں سے جمہوری تربیت دی۔ ایک' انھیں اپنے طرز حکومت کے معیارات و مقاصد بتائے۔ جیسے آزادی اور مساوات اور پارلیمانی جمہوریت۔ دوسرے' اپنا نمونہ دکھایا۔ تیسرے' آزادی کے لیے ان سے عوامی جمہوری تحریکیں شروع کروائیں۔ لیکن اس استعمار کی تربیت یافتہ یہ قومی تحریکیں صحیح معنوں میں جمہوریت کو بر سرعمل نہ لا سکیں۔ انھیں اختلاف رائے اور بحث و مباحثے کی برداشت نہ تھی۔ انتخابات بار بار نہ ہونے سے جمہوریت صرف کاغذ پر رہ گئی۔

م: کیا خوب جمہوریت کی تربیت دی' جمہوریت کے پرستار مغرب نے اپنے جانشینوں کو جنھیں اس نے اپنے بعد اقتدار سنبھالنے کے لیے تیار کیا! خوف ناک ہوا تو اس خطرے کو بنا کر پیش کیا جا رہا ہے کہ کوئی اسلامی پارٹی ایک بار انتخابات میں جیت گئی تو دوبارہ انتخاب کا موقع ہی نہ دے گی' دے گی تو اس میں صرف اسلام کو تسلیم کرنے والے حصہ لے سکیں گے۔ لیکن مغرب کے ان شاگردوں نے ـــــ جیسے مصطفیٰ کمال' جمال عبدالناصر' صدام حسین' حافظ اسد' حسنی مبارک' سوہارتو وغیرہ ـــــ تو نصف صدی تے بد ترین آمریتیں قائم کر رکھی ہیں: نہ اظہار رائے کا حق ہے' نہ اختلاف کا' نہ جماعت سازی کا' نہ پریس آزاد ہے' نہ آزادانہ انتخابات ہوتے ہیں جن میں حکمران پارٹی کے علاوہ کوئی جیت سکے' بنیادی حقوق کا نام و نشان نہیں' اپوزیشن کو ہر طرح کچل دیا جاتا ہے' جیلیں بھری ہوئی ہیں' بد ترین عقوبتیں دی جاتی ہیں' مخالفین پھانسی کے تختوں پر لٹکائے جا رہے ہیں' زبانوں پر تالے ہیں' اختلاف کے جرم میں پوری بستیاں منا دی جاتی ہیں۔ "جمہوریت صرف کاغذ پر رہ گئی ہے"' کا ہلکا سا اعتراف تو بد تر از گناہ ہے۔ غالباً مغرب کو اپنی تربیت سے یہی آمریت مطلوب تھی' تاکہ اس کے ذریعے مسلمانوں کی گردنوں پر اس کا اقتدار مسلط رہے۔

ز: اب آزادی کے نصف صدی کے بعد' خصوصاً کمیونزم کے زوال کے نتیجے میں' جمہوریت کی تازہ لہر آئی ہے۔ لیکن مسلمان ملکوں میں اس کا خاص اثر اور مفہوم ہے۔ اس لیے کہ یہاں ساتھ ساتھ اسلام کے احیا کی لہر بھی اٹھ رہی ہے۔ اس وقت جمہوریت کی اہمیت اور اثر دو پہلوؤں سے اور زیادہ ہے۔ ایک طرف' ریاست کے وظائف میں' اور نتیجتاً اس کی طاقت میں' ماضی کے مقابلے میں غیر معمولی اضافہ ہو چکا ہے۔ مسلم ممالک میں ملازمت' تعلیم' علاج اور دیگر سماجی ضروریات زیادہ تر ریاست کے قبضے میں ہیں' قوانین کی بھرمار ریاست کو ہر شہری کی روزمرہ زندگی میں دخیل کر دیتی ہے۔

اس طرح حکومت لوگوں کی زندگیاں کنٹرول کرنے کے لیے بہت بڑا سرچشمہ ہے۔ صرف جمہوری قوتوں ہی کے لیئے نہیں' دوسری قوتوں کے لیے بھی۔ دوسری طرف ریاستی اقتدار' عوام سے دور چند افراد کی شکار گاہ بن گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں عوام میں حکمرانوں کے خلاف عدم اعتماد' بے چینی اور بغاوت پیدا ہو رہی ہے جو ۸۰ کے عشرے میں نمایاں رہی۔ ۱۹۸۱ اور ۱۹۸۴ میں کاسابلانکا میں ' ۱۹۸۸ میں سارے الجیریا میں ' ۱۹۸۴ میں تیونس میں ' ۱۹۸۶ میں قاہرہ اور مصر کے دوسرے شہروں میں ' ۱۹۸۹ میں عمان میں ' ۱۹۸۶ میں مسجد الحرام 'مکہ میں اور ۱۹۷۹ میں انقلاب ایران میں ' سارے ہنگامے مسلم ممالک کے حکمرانوں کے خلاف عوامی غیظ و غضب کا اظہار تھے۔ ایک طرف یہ ناکام اور جابر حکمران ' دوسری طرف جمہوریت کی لہر' ایک دھماکہ خیز صورت حال بن گئی ہے۔ یہ جمہوریت کی بقا کے لیے خطرناک ہے کہ اسے ایک صحت مند طریق کار کے بجائے ان نتائج کی ضمانت تصور کیا جا رہا ہے جو موجودہ حکمران پیدا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ چنانچہ جمہوریت کی اس لہر کو استعمال کرنے کے لیے سب سے طاقت ور قوت سیاسی اسلام بن گیا ہے ' جو کلام الٰہی کی راہ نمائی اور ضمانت پر اخلاقیات کی بحالی ' دنیاوی ترقی اور بدعنوانیوں سے نجات کا یقین دلاتا ہے۔ اس طرح جمہوریت کا حلیہ بگاڑ دینے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

م: اسلامسٹ آخر کس ''جمہوریت'' کا حلیہ بگاڑ دیں گے ؟ اس کا جو مغرب کی کتابوں میں بستی ہے 'یا اس کا جو مصر' تیونس 'شام 'سعودی عرب 'انڈونیشیا وغیرہ میں قائم ہے؟ اب اس میں مزید بگاڑنے کی کیا گنجایش ہے۔ اسلامسٹ آجائیں تو کچھ بہتری ہی پیدا کریں گے 'ہاں مغربی مفادات اور تسلط کا حلیہ ضرور بگڑ سکتا ہے۔

ز: ویسے تو اسلام اور جمہوریت میں کوئی بنیادی تضاد نہیں ہے۔ قرآن میں کسی خاص طرز حکومت کو سند نہیں دی گئی ہے' نہ جمہوریت کی واضح حمایت کی گئی ہے۔ اس کے مفہوم سے قریب ترین آیت اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ ہے۔ قرآن کا زور حکمرانوں کی اخلاقی صفات پر ہے 'ان کے طریق انتخاب پر نہیں۔ تضاد اس وقت ابھر کر سامنے آتا ہے جب یہ سیاسی اسلام 'جمہوریت کی اصل اساس ۔ کھلی بحث اور کسی بھی حل کو قبول کرنے کی آزادی کو ختم کر دیتا ہے 'اور صرف حق کے ماننے والوں ہی کو انتخاب میں حصہ لینے کی اجازت دیتا ہے۔ جب کوئی پارٹی مذہب کو اس طرح اختیار کرے کہ اس کی علامات پر اپنی اجارہ داری قائم کر لے اور مخالفین کی قانونی حیثیت ختم کر دے 'تو کھلی بحث اور مستقبل میں آزاد انتخابات کی ضمانت دینا مشکل ہو جاتا ہے۔

م: جمہوریت کے فلسفے اور عوامی حاکمیت کو ایک طرف رکھیے 'شوریٰ کے بارے میں نص قرآنی کہ مسلمانوں کے اجتماعی امور ان کی مرضی اور رائے سے طے کیے جائیں یہ بتانے کے لیے بالکل کافی ہے کہ جمہوریت بطور طریق کار کے 'اور بطور طرز حکومت کے 'اسلام میں مطلوب اور مامور ہے۔ رائے کیسے لی جائے '

جمہوری نظام کی تفصیلات کیا ہوں' یہ چیزیں مسلمان اپنے حالات کے لحاظ سے اپنی رائے سے طے کرنے کے لیے آزاد ہیں۔ کیا قرآن' ۱۴ سو سال پہلے' ڈیماکریسی اور پارلیمانی حکومت کا نام لے کر ان کی واضح حمایت کرتا؟ مشکل یہی ہے کہ مغرب قرآن کے اس اسلوب ہدایت کو سمجھنا نہیں چاہتا کہ اصول طے کر دیے جائیں' تفصیلات اجتہاد پر چھوڑ دی جائیں۔ جو کتاب ہدایت ہے' ۱۴ سو سال پہلے کے لیے بھی اور ۱۴ سو سال بعد کے لیے بھی' بدوی معاشرے کے لیے بھی اور شہری معاشرے کے لیے بھی' اس کے لیے یہی اسلوب ہدایت ہونا چاہیے تھا۔

۱۴ سو سال سے اس آیت کا یہی مطلب سمجھا گیا ہے کہ جائز حکمراں وہی ہے جسے رائے عامہ کی تائید حاصل ہو' بزور بیعت لینے والوں کو کبھی جائز حکمراں تسلیم نہیں کیا گیا۔ اسلامی دستور کے بنیادی اصولوں پر پاکستان کے علما کے اجماع میں یہ بات شامل ہے کہ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر آزادانہ انتخابات کے ذریعے حکمراں منتخب ہوں گے۔ دو سب سے بڑی اسلامی تحریکیں' جماعت اسلامی اور اخوان المسلمین بھی اسی موقف کی علم بردار ہیں۔

ز: اسلامی پارٹیاں اور حکومتیں اپنے ارادوں کے بارے میں صاف بات کرتی ہیں' مگر الجیریا کے اسلامی فرنٹ کی طرح مغربی پریس کے سامنے تو جمہوری ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں' لیکن مقامی جلسوں میں اعلان کرتی ہیں کہ "جمہوریت" کفر ہے اور اسلام کو ماننے والے ہی انتخابات میں حصہ لے سکیں گے۔ یہ دونوں موقف جمہوریت کے خلاف ہیں۔

م: اسلامسٹ کوئی دورخی بات نہیں کرتے۔ جب وہ کہتے ہیں کہ ہم جمہوریت کے قائل ہیں تو ان کی مراد ہوتی ہے اس کا طریق کار اور طرز حکومت۔ جب وہ کہتے ہیں کہ "جمہوریت کفر ہے" تو ان کی مراد ہوتی ہے وہ مغربی جمہوریت جو خدا کو خارج کر کے رائے انسانی کی حاکمیت پر قائم ہے۔ کسی بھی نظام میں وہی لوگ انتخابات میں حصہ لے سکتے ہیں جو اس نظام کو قبول کریں۔ جو امریکن دستور کو قبول نہ کرے وہ امریکہ میں انتخابات میں کیسے حصہ لے سکتا ہے؟

ز: کھلی بحث کے مسئلے پر اسلام اور جمہوریت کا موقف یکساں ہے' لیکن ایک لحاظ سے بالکل مختلف ہے۔ دونوں کا موقف ہے کہ بحث کے نتیجے میں حق کا غلبہ ہو گا' لیکن جمہوریت پسند کے نزدیک یہ غلبہ آزادانہ بحث اور فیصلے کے اصول کا غلبہ ہے' جبکہ اسلامسٹ کے نزدیک الہامی حق کا۔

م: آزادانہ بحث اور فیصلوں پر "حق" کو غلبہ ہونا چاہیے' یہ اصول تو مغربی جمہوریت میں بھی اسی طرح مسلم ہے جس طرح اسلام میں۔ اختلاف اس پر ہے کہ وہ حق کیا ہو۔ امریکہ میں کمیونسٹ پارٹی غیر قانونی ہے اور اسے بحث و انتخاب میں حصہ لینے کی اجازت نہیں۔ صرف اس لیے کہ وہ تشدد سے تبدیلی اقتدار پر یقین رکھتی ہے' یعنی اس "حق" کی مخالف ہے جس پر امریکی نظام قائم ہے۔ اگر عوامی نمایندے کوئی ایسا قانون پاس کر دیں جو امریکی دستور کے خلاف ہو' تو وہ مسترد کر دیا جاتا ہے۔ گویا "دستور" ایک ایسا "حق" ہے جسے عوامی فیصلے پر غلبہ حاصل ہے' اور حق کی تعبیر کا یہ اختیار صرف ۱۲ افراد کی سپریم کورٹ کو حاصل ہے۔ گو اینگلو سیکسن

قانون کے ماہرین عوام کے فیصلے کو مسترد کریں تو عین جمہوریت ہے' اسلامی فقہ کے ماہرین کریں تو ملا کی آمریت ہے۔ لیکن ہم تو وحی کی تعبیر کا آخری حق بھی کسی ملا کو نہیں دیتے' عوام ہی کو دیتے ہیں۔کہا جاسکتا ہے کہ عوام دستور کو بدل سکتے ہیں' جبکہ قرآن کو نہیں بدلا جاسکتا۔یہ صحیح ہے۔ لیکن اول تو ترمیم دستور کا عمل اتنا مشکل ہے کہ ترمیم محال ہے۔ دوسرے' اب ہندستان کی سپریم کورٹ یہ طے کر چکی ہے کہ اگر دستور میں باقاعدہ ترمیم کر بھی دی جائے' لیکن وہ دستور کی روح اور بنیاد سے متصادم ہو تو ایسی ترمیم دستور بھی خلاف دستور ہے۔ لیجیے اب ''حق'' دستور سے ماورا ہو گیا۔ سوال ہے کہ کیا دستور میں ترمیم کر کے بنیادی حق واپس لیے جاسکتے ہیں؟ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ کے نزدیک اصول انسانی ہوں تو ان کا غلبہ صحیح ہے' الہامی ہوں تو صحیح نہیں۔ گویا انسان خود تو ''خدا'' ہو سکتا ہے' خدا' خدا نہیں ہو سکتا۔

ز: زیادہ بڑی پیچیدگی یہ ہے کہ اسلامی پارٹی میں ایک نظر آنے والا معتدل گروہ ہوتا ہے اور ایک زیر زمین انتہا پسند گروہ۔ معتدل گروہ کو کنٹرول میں رکھا جاتا ہے اور جب یہ جمہوری ذرائع سے اقتدار حاصل کر کے اپنا کام پورا کر لیتا ہے تو انتہا پسند گروہ اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ جمہوریت اور اسلام کے درمیان تطابق کا مسئلہ صرف ''بیانات'' کی بنیاد پر نہیں بلکہ ممکنہ سیاسی عمل کی نوعیت کی بنیاد پر کیا جانا چاہیے۔ اہم سوال یہ ہے کہ خواہ دونوں کے' درمیان تصادم جاری رہے' کیا کیا جاسکتا ہے کہ سیاسی اسلام کے باوجود جمہوریت کو تباہ ہونے سے بچا کر محفوظ رکھا جائے۔

م: ان زیر زمین انتہاپسند گروہوں کا ''علم'' صرف آپ کے پاس ہے' بالعموم ان کا وجود کہیں نہیں پایا جاتا۔ اگر ایک انتہائی آمرانہ نظام میں تبدیلی جمہوری ذریعے سے آئے' مگر اسلامسٹ پارٹی کے جیتنے کا امکان بھی ہو' تو پھر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ''جمہوریت'' کو تباہی سے بچانے کے لیے (جو ابھی خواب و خیال میں ہے) آپ کتنے غیر جمہوری بننے کے لیے تیار ہیں۔

ز: ایک دستوری طریقہ جو اکثر مسلمان ملکوں نے اختیار کیا ہے' یہ ہے کہ اسلام کو ریاست کا مذہب بنایا جائے لیکن اسلامی پارٹیوں کو غیر قانونی رکھا جائے تاکہ وہ انتخاب میں حصہ نہ لے سکیں۔

م: آپ اس کے لیے بھی تیار ہیں کہ اسلام کے نام پر لوگوں کو دھوکہ دیا جائے' اسلام کا استحصال کیا جائے' اور آزادانہ انتخاب میں' جن کی بقا کے لیے آپ مضطرب ہیں' ناپسندیدہ اسلامی پارٹیوں کو حق اجتماع اور حق اظہار رائے سے محروم کر کے' انتخابات میں حصہ لینے سے روک دیا جائے۔

ز: دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک بھروسے کے قابل حزب اختلاف قائم کی جائے۔ آج کل ایک بدعنوان آمرانہ حکومت اور اسلامی حزب اختلاف کے درمیان تصادم ہو تو مصیبت یہ ہے کہ متبادل قوت موجود نہیں۔ الجیریا میں ۱۹۹۰' ۱۹۹۱' ۱۹۹۲ میں جو ہوا اسے اسلامک فرنٹ کی فتح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہوا یہ کہ بر سراقتدار پارٹی پر عدم اعتماد کے بعد کوئی دوسری ایسی پارٹی میدان میں نہیں رہ سکی جو ووٹ حاصل کر سکتی' نتیجہ یہ کہ فرنٹ کے سارے ووٹ جمع کر لیں تو بھی ڈالے ہوئے ووٹوں کا ۲۷ فی

صد اور کل ووٹوں کا ۲۵ فی صد ہے۔اس کے مقابلے میں کوئی ایسی پارٹی تھی ہی نہیں جو ووٹوں کی اکثریت کو باہر نکال سکتی یا قوم کی اکثریت کا اعتماد حاصل کر لیتی۔اس کے مقابلے میں مصر اور تیونس میں بدعنوان حکومتوں کی مضبوط سرکاری پارٹیوں نے آزادانہ حیثیت سے کھڑے ہونے والے اسلامسٹ امیدواروں کو شکست دے دی۔

م: متبادل حزب اختلاف کی راہ میں اسلامسٹ تو بالکل حائل نہیں آپ شوق سے قائم کریں۔لیکن جن الفاظ میں آپ نے مصر اور تیونس کے واحد جماعتی' جابرانہ انتخابات میں' جن میں اسلامی پارٹیوں کو حصہ لینے کی اجازت ہی نہیں' نام نہاد آزاد اسلامی امیدواروں کی شکست پر داد تحسین دی ہے اس کو دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ 'اس سادہ لوحی پر کون نہ مرجائے اے خدا۔

آپ نے الجیریا میں اسلامی فرنٹ کی جیت کو جیت تسلیم نہ کرنے کے لیے بھی خوب دلیل دی۔اب آپ کو ڈالے ہوئے ووٹوں کا اور کل ووٹوں کا فی صد یاد آیا۔ ذرا پاکستان' امریکہ' برطانیہ کے نتائج کو بھی اسی پیمانے سے ناپیے۔

ز: تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ایسے انتخابی قواعد اور طریق کار بنانے چاہیں کہ ایک کثیر الجماعتی نظام وجود میں آئے اور ایک اسلامسٹ پارٹی کے حکومت پر کنٹرول کے امکانات کم سے کم ہو جائیں جیسے متناسب طریق نمایندگی' کسی ایک بڑی پارٹی کے کلی اقتدار کے امکان کو ختم کر دیتا ہے۔یہ اور انتخابی قوانین میں دیگر موزوں تبدیلیاں کر کے بھی انتہا پسند پارٹیوں کا کردار محدود کیا جا سکتا ہے۔

چوتھا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ جب تک حالات سازگار نہ ہوں جمہوری نظام کو موخر کر دیا جائے۔ خواندگی اور شہر کاری میں اضافے کے ساتھ' آزاد پریس' آزاد عدلیہ' بنیادی حقوق کا احترام جمہوری نظام کی لازمی شرائط ہیں۔لیکن مسئلہ یہ ہے کہ شرائط کو پورا کرنا اور پھر انھیں باقی رکھنا' آزادانہ انتخابات کے انعقاد سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔

م: آپ انتخابی قواعد و قوانین میں ہیر پھیر اور گھپلے میں بھی کوئی ہرج نہیں سمجھتے' اگر اس سے اسلامسٹوں کا راستہ رک سکتا ہو۔متناسب نمایندگی ایک دو دھاری تلوار ہے۔ممکن ہے اسلامک پارٹی مجرد اکثریت نہ بن سکے لیکن پھر وہ اپنی تھوڑی تعداد سے بھی کنگ میکر بن سکتی ہے۔

ز: پانچواں طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ جب بھی جمہوری عمل ہو' اسے ہونے دیا جائے اور جسے بھی اکثریت حاصل ہو' خواہ اسلامسٹ ہی کیوں نہ ہوں' اسے حکومت کرنے دی جائے تاکہ وہ عملاً جمہوریت کے آداب سیکھ سکیں۔تجربہ بتاتا ہے کہ حکومت کی ذمہ داری انتہا پسند گروہ کو بھی معتدل بنا دیتی ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ یہ تجربہ ہر جگہ دہرایا جائے۔دوسرا تشویش ناک تجربہ یہ ہے کہ انقلابیوں کے معتدل ہونے میں ایک نسل لگ جاتی ہے' جیسا کہ ایران کے تجربے سے ظاہر ہے۔مشکل یہ ہے کہ یہ تجربات سوشل سائنٹسٹ کے لیے تو دلچسپ ہو سکتے ہیں' لیکن عوام کے لیے مصیبت اور دنیا کے لیے

تباہی کا باعث بن سکتے ہیں۔ اسلام کے اندر جدلیاتی عمل، ہو یا اسلام اور جمہوریت کے درمیان محاذ آرائی، کچھ نہ کچھ قیمت تو ادا کرنا ہوگی۔ اب یہ مسلم ممالک کے عوام کو انتخاب کرنا ہے کہ وہ کس کی کیا قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔

م: ہمیں آپ سے اتفاق ہے اور ہماری مغرب سے یہی درخواست ہے کہ آپ مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں، اور اسلامسٹوں کی متوقع کامیابی کی صورت میں جمہوریت کی تباہی کے موہوم خطرے کے خلاف تحفظ کے نام پر نصف صدی سے قائم آمرانہ، کرپٹ اور نااہل حکمرانوں کی حمایت اور اسلامسٹوں کا راستہ روکنے کی خونیں کوششیں ترک کر دیں۔ جو قیمت ادا کرنا ہوگی وہ مسلمان کریں گے، اگر وہ اسلام کے مطابق جینا چاہتے ہیں۔ لیکن کیا آپ ''اسرائیل'' اور ''تیل کے چشموں'' کے تحفظ سے دست بردار ہو سکتے ہیں!

رسائل و مسائل

برش اور مسواک

رسائل و مسائل (فروری ۹۵) میں کہا گیا ہے کہ حدیث میں مسواک کی متعین کردہ حکمت و مصلحت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ چیز جس سے منہ کی صفائی ہوتی ہو' مسواک کا مقصد پورا کر سکتی ہے' لہٰذا برش جو مسواک کی جدید قسم ہے اس سے سنت ادا ہو جائے گی۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ مختلف ٹوتھ پیسٹ میں خوبیاں ضرور ہوتی ہیں' لیکن پھر بھی وہ فوائد حاصل نہیں ہوتے جو جدید تحقیق کے مطابق پیلو کی مسواک سے ہوتے ہیں۔ میرے پیارے نبی ؐ کی ہر بات' ہر کام حکمت و دانائی والا ہے۔ آپ ؐ مسواک کی خوبیاں جانتے تھے۔ جو بات آپ ؐ نے چودہ سو سال پہلے بتا دی وہ باتیں اب تحقیق کرنے سے صحیح ثابت ہو رہی ہیں۔ رسول اکرم ؐ صرف منہ کی صفائی چاہتے تو فرما دیتے کہ منہ اچھی طرح صاف کیا کرو' لیکن آپ ؐ نہ صرف دانتوں کی صفائی بلکہ اور دوسرے فوائد بھی چاہتے تھے لہٰذا آپ ؐ نے مسواک کرنے پر زور دیا ہے۔ آخر برش مسواک کا بدل کیسے ہو سکتا ہے؟

حضور ؐ نے مسواک کرنے کی سخت تاکید فرمائی' اور خود اس کا ہمیشہ اہتمام فرمایا۔ لیکن اس بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی کہ وہ کس شکل صورت اور سائز کی ہو' اور کس چیز سے کس طرح بنی ہو۔ نہ یہ ہدایت دی کہ وہ لازماً درخت کی لکڑی ہو' اور پیلو ہی کی ہو۔ نہ میرے علم میں کوئی ایسی حدیث ہے کہ آپ ؐ نے ہمیشہ صرف پیلو کی مسواک ہی استعمال فرمائی۔ روایات میں اراک (پیلو) کے علاوہ عنم' بطم (صنوبر)' زیتون کا ذکر بھی آیا ہے۔ نیم' کیکر' پھلاہی وغیرہ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ہاں' آپ ؐ نے مسواک کی علّت واضح فرمائی کہ یہ منہ کی صفائی کا ذریعہ ہے' اور اسی لیے رب کی رضامندی کا۔

درخت کی لکڑی کو یقیناً' طبی نقطہ نظر سے' نائلون کے برش پر ترجیح حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح پیلو کی لکڑی سے مسواک' حب نبوی ؐ کے پہلو سے' برش کی بہ نسبت محبوب ہونا چاہیے۔ پیلو کے طبی منافع بھی مسلّم ہیں' جو برش میں نہیں پائے جاتے' لیکن مسواک کے سلسلے میں اتنی تاکید کی گئی: اگر

امت کے لیے شاق نہ ہوتا تو میں ہر نماز سے قبل مسواک کا حکم دیتا (بخاری، مسلم)۔

ہر زمانے میں ' ہر جگہ ' اور تعداد اگر ایک ارب ہو تو ہر مسلمان کو پیلو کی ' یا لازماً درخت ہی کی لکڑی دستیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ سنت پیلو کی لکڑی ' یا صرف درخت کی لکڑی سے دانت صاف کرنے ہی سے ادا ہو تو یہ ہر ایک کے بس میں نہیں ہو سکتا کہ وہ سنت کی پیروی کرے اور اس پر موعودہ اجر حاصل کرے۔ ایسا لازمی ہونا اصول تشریع کے بھی خلاف ہوتا۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ مسواک کے لغوی معنی برش کے ہی ہیں۔

یہ اسی طرح ہے جس طرح کہ ستر پوشی کا حکم دیا گیا' حضورؐ نے اس کا اہتمام فرمایا' اپنے زمانے میں رائج لباس اس مقصد کے لیے استعمال فرمائے' مگر کسی خاص وضع قطع کے لباس کی صراحت نہ فرمائی۔ اب اس حکم کی تعمیل اور سنت کی ادائگی کے لیے تہمد' چادر اور صافہ ہی ضروری نہ ہوں گے۔ آپؐ نے لباس کی جو علت بیان فرمائی' یعنی ستر پوشی اور زینت' وہ جس لباس سے پوری ہو' بشرطیکہ وہ لباس شرعی حدود میں ہو' اس سے حکم کی تعمیل ہو جائے گی۔ آپؐ کے زمانے میں شلوار بازار میں آئی تو روایت کے مطابق آپؐ نے اسے پسند فرمایا اور کہا کہ یہ زیادہ ستر پوش اور پاکیزہ ہے۔

پیلو کے طبی فوائد تسلیم' لیکن علت حکم حضور کی ہدایت ہے نہ کہ طبی فوائد' اس لیے میری نظر میں مولانا گوہر رحمٰن صاحب کی رائے بالکل درست ہے۔ برش سے پیلو کے طبی فوائد نہ بھی حاصل ہوں مگر سنت ادا ہو جائے گی۔

مایوسی کا مرض

دعا کرنے اور بار بار کرنے کے باوجود بھی اگر حاجت پوری نہ ہو تو... کیا دعا صرف مقرب بندوں کی سنی جاتی ہے... پھر گناہگار بندہ کیا کرے؟ جب بار بار پکارنے اور نہ صرف خود پکارنے بلکہ اپنی والدہ سے بھی انتہائی دل سوزی سے دعائیں کروائی جائیں اور پھر بھی رحمت خداوندی جوش میں نہ آئے تو پھر مایوسی کے علاوہ کیا راستہ رہ جاتا ہے۔ مایوسی کے سائے اس وقت اور بھی گہرے ہو جاتے ہیں جب اپنے وہ ساتھی بڑے مناصب پر نظر آتے ہیں جو بوڑھوں پر طنز کرتے تھے اور اساتذہ کا احترام نہ کرتے تھے۔ شاید حسد اور بغض بھی انھی محرومیوں اور مایوسیوں کا نتیجہ ہو جو ہر آن بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ بعض اوقات تو آخرت میں ملنے والے انعام و اکرام کے وعدے بھی محض کہانیاں معلوم ہوتے ہیں اور یہ خیال انسان کے گناہوں میں مزید اضافے کا موجب بن جاتا ہے۔ ذرا روایتی انداز سے ہٹتے ہوئے بتائیے کہ ایسے میں ایک گناہگار بندہ کیا کرے؟ سنا ہے کہ اسم اعظم نصیبوں کے لیے پارس کا حکم رکھتا ہے۔ کوئی اسم اعظم ہی بتا دیجیے۔

اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے اور آپ کو مایوسی کی کیفیات سے نکلنے کی توفیق دے۔ یہ زندگی تو امتحان گاہ ہے۔ نعمت ہو یا مصیبت' کشادگی ہو یا تنگی' ہر چیز اپنے تزکیے اور آخرت کمانے کا ذریعہ ہے۔ ان دنیوی واردات کے ذریعے جو آخرت کما لے وہی خوش نصیب اور دولت مند ہے۔ جن لوگوں کو دنیاوی زندگی میں نعمتیں ملی ہوئی ہیں اور آپ ان پر رشک و حسد کر رہے ہیں' ان کی یہ نعمتیں ان کے لیے آپ کے مصائب سے بڑھ کر مصائب ہیں اگر وہ شکر نہ کریں۔ اگر یہ نہ ہوتا کہ سب ہی کافر ہو جائیں گے' تو اللہ کافروں کے گھر' فرنیچر سب سونے چاندی کے بنا دیتا (زخرف)۔ مشکل یہ ہے کہ امتحان آپ کا ہے' یسر و عسر میں شکر و صبر آپ کو کرنا ہے' اجر آپ کو ملنا ہے' اس لیے کام آپ ہی کو کرنا ہے۔ اپنی محنت' اپنے ارادے اور سعی' کے علاوہ نہ کوئی اسم اعظم ہے نہ پارس جو آپ کا کام کر دے۔ مگر علم و یقین اور ایمان کے سارے دروازے' جو دراصل آپ کی مدد کر سکتے ہیں' آپ خود ہی بند کرتے چلے جا رہے ہیں: یہ بھی نہ کہیے یہ بھی نہ سمجھایئے' یہ میں جانتا ہوں' یہ میں بہت سن چکا ہوں۔ آپ خود اپنی مدد نہ کریں' بلکہ اپنی خرابی کا سامان کریں' تو دوسرا آپ کی مدد کیسے کر سکتا ہے۔ پھر مایوسی کا مرض تو کینسر کا حکم رکھتا ہے۔ آپ جان بوجھ کر امید کے سارے دروازے بند کر کے' خود کو مزید مایوسی کے اندھیروں میں دھکیلتے جا رہے ہیں۔

اسم اعظم جو پارس کا کام کرے گا ایک ہی ہے: میرا رب اللہ ہے جو حی و قیوم ہے' وہ میرے ساتھ ہر وقت ہے اور میری راہ نمائی کرتا ہے اور کرے گا (انَّ ربی معی سیھدین)' اس کا وعدہ ہے کہ وہ میرے ساتھ رحم کا برتاؤ کرے گا اس لیے کہ میں اس پر ایمان رکھتا ہوں (کَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا)' اس کی نعمتیں مجھ پر روز اس طرح برس رہی ہیں کہ میں شکر ادا کرنے سے قاصر ہوں۔

آپ کے جسم کا ایک خلیہ بھی فاسد ہو جائے (malignant) پھر آپ دیکھیے آپ پر کیا گزرتی ہے۔ وہ آپ کو بلا مانگے' بلا استحقاق' ساری ناشکریوں اور مایوسیوں کے باوجود اتنا دے رہا ہے۔ آپ دعا کے معاملے میں debit-credit کا لیجر کھولے بیٹھے ہیں۔ دعا تو اس سے قرب' ہم کلامی اور حمد و احتیاج کے اظہار کا موقع ہے۔ کچھ نہ ملے تو بھی اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے۔

اللہ کی ذات سے امید ہے کہ ان سطور سے آپ کو روشنی کی کرن نظر آئے گی۔

لاحاصل سوالات

یہ بات وجدانی طور پر میں محسوس کرتا ہوں کہ اس طرح کے سوالات کے جواب سے ہر انسان عاجز ہے۔ ہم اس کی ذات و صفات کا ادراک نہیں کر سکتے وہ خدا ہی کیا جو ہمارے درک میں آ

جائے۔ اور یہ بھی کہ یہ متشابہات ہیں اور ایسے سوالوں کی کھوج کرید سے اللہ کے رسول ؐ نے منع فرمایا ہے --- تاہم سوالات پیش کر رہا ہوں۔

۱- اللہ ازل سے ہے - ایک وقت تھا جب اللہ کے سوا کوئی شے نہ تھی - پھر آخر کس غرض کے لیے یہ کائنات پیدا کی گئی؟ اس سے آخر کیا فائدہ ہوا؟ نہ پیدا کرنے کی صورت میں نقصان کیا ہوتا؟ ہمارے امتحان (جبکہ رزلٹ سے سوفیصدی وہ آگاہ ہے) سے کیا حاصل؟ یہ کیسا دار الامتحان ہے کہ ہر پرچہ دینے والے کا رزلٹ پہلے ہی معلوم ہے اور ایسا معلوم ہے کہ اس میں بال برابر بھی فرق نہیں آسکتا۔

۲- باجی پہلے باقاعدگی سے نماز پڑھا کرتی تھیں - پانچ وقت روزانہ وضو کرنے سے ان کے ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کی درمیانی جگہ گل گئی - پھر وہ کبھی کبھی نماز پڑھنے لگیں اور اب وہ بھی ترک کر دی - باوجود ان وسوسوں کے جن کا ذکر آپ سے کیا ہے نماز پڑھنا میں نے ترک نہیں کیا' بار بار کے وضو سے اب میں بھی یہ خدشہ محسوس کرتا ہوں کہ کہیں میرے ساتھ بھی ایسا نہ ہو - اس لیے اکثر ہاتھوں کو زمین اور دیوار پر مارتا رہتا ہوں کہ وہ نرمی جو بار بار دھونے سے ہاتھوں میں پیدا ہوئی ہے' دور ہو - پھر یہ بھی بات ہے کہ ہمیں تو وضو کرنے کے بہت سے طبی فوائد گنوائے جاتے ہیں مگر باجی کے لیے یہ الٹا نقصان کا باعث ہوا - میں اگرچہ نماز سے جی نہیں چراتا مگر وضو سے مجھے انتہائی کراہت ہوتی ہے - کیا اس بات کی گنجائش نکل سکتی ہے کہ مجھے صرف صبح اور عشاء کی نماز کے لیے وضو کرنا پڑے - اسلام تو کسی پر تنگی نہیں کرتا۔

۱- آپ خود اس نتیجے تک پہنچ چکے ہیں کہ ہم خدا کی ذات و صفات کا مکمل ادراک نہیں کر سکتے' اور اس لیے ایسے امور میں کھوج کرید سعی لاحاصل ہے - لیکن آپ نے جو دو سوالات کیے ہیں' وہ بھی اسی قبیل کے ہیں۔

تخلیق سے کیا فائدہ ہوا' کیا حاصل ہوا' اس کے دو پہلو ہیں - اگر مراد یہ ہے کہ انسان کو کیا فائدہ ہے' تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اپنی فطری استعداد کو استعمال کر کے' رب کی بندگی کر کے' اس کی رضا اور جنت حاصل کر سکتا ہے - اگر اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کو کیا فائدہ ہوا' تو یہ دراصل خالق کو مخلوق کی صف میں لا کر کھڑا کرنا ہے - اس کا غصہ' اس کی رضا' اس کی رحمت' اس کا غضب ہماری طرح کے نہیں' ہمارے فہم اور تجربے سے ماورا ہیں۔

جب تک امتحان دینے والا آزادی محسوس کرتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے' اسے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کا رزلٹ پہلے ہی سے معلوم ہے - انسان استاد بھی شاگرد کی صلاحیت و استعداد دیکھ کر رزلٹ پہلے ہی سے بتا سکتے ہیں - وہ خدا' خدا کیسے ہو گا جسے یہ علم بھی نہ ہو کہ کل اس کی کائنات میں ایک ذرہ بھی کیا کرنے والا ہے

۲- اگر پانچ وقت روزانہ وضو کرنے سے ہی انگلیاں گل گئیں 'اور طبی رائے بھی یہی ہے 'تو تیمم کیا جاسکتا ہے 'ایک دفعہ وضو کر کے موزہ پہن کر اس پر مسح کیا جاسکتا ہے 'اور صورتیں بھی ہو سکتی ہیں- نہ یہ کہ نماز جیسا فرض ترک کر دیا جائے- اگر یہ وسوسے کی وجہ سے وضو میں مبالغے کا نتیجہ ہے 'تو وسوسے سے نجات ہی حاصل کرنا چاہیے 'اور جب تک نہ ہو موزہ اور مسح کا راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے-

وضو اللہ کو محبوب ہے 'قیامت کے دن وضو کے اعضا نور سے چمکیں گے 'وضو سے ہر عضو کے گناہ دھل جاتے ہیں 'پھر آپ کو وضو سے کراہت کیوں ہو- دیوار پر ہاتھ مارنا تو وسوسے کا نتیجہ ہے- آپ کسی ڈاکٹر سے مشورہ کر لیجیے- پانی سے کھال کا گلنا میں نے آج تک نہیں سنا 'لیکن ڈاکٹروں سے مشورے کے بعد اس کی تائید ہو تو آپ بھی فجر کے وقت وضو کر کے موزے پہن لیں- باقی چار وقت مسح کرلیں- لیکن طبی مشورے اور وسوسے کے علاج کی نیت سے 'وضو سے کراہت کی بنا پر نہیں اللہ اور اس کے رسول ؐ کے احکام سے کراہت ایمان کے منافی ہے (خرم مراد)-

---

آئیے کارِ مسیحائی کریں



الخدمت ویلفیئر سوسائٹی (رجسٹرڈ) نے پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن کے تعاون سے کراچی کے پسماندہ علاقے ضلع غربی میں اورنگی ٹاؤن، قصبہ، علیگڑھ کالونی، بنارس اور قرب و جوار میں رہائش پذیر دکھی لوگوں کے لئے جدید سہولیات سے آراستہ ۱۰۰ بستروں کے ہسپتال کا منصوبہ تشکیل دیا ہے، اس منصوبے کے تعمیراتی اخراجات کا تخمینہ دو کروڑ روپے ہے۔

الخدمت ہسپتال

بالمقابل اورنگی ٹاؤن تھانہ، اورنگی ٹاؤن کراچی

فون: 6668893 - 6668894 فیکس: 6652883

اپنے عطیات بنام الخدمت ویلفیئر سوسائٹی کراچی (رجسٹرڈ) اکاؤنٹ نمبر 6/6 مسلم کمرشل بنک خداداد کالونی برانچ میں جمع کروائیں

الخدمت ویلفیئر سوسائٹی کراچی (رجسٹرڈ)

عطیہ اشتہار۔ پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن کراچی۔

کتاب نما

المسئلة الشرقیہ : مصطفیٰ کامل پاشا مصری، مترجم: سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ ناشر: ادارہ معارف اسلامی، منصورہ، لاہور۔ صفحات: ۳۸۲۔ قیمت: درج نہیں۔

آخر ۱۹ویں صدی کے مصری اکابر میں مصطفیٰ کامل پاشا (۱۸۷۴-۱۹۰۸) کا نام اپنی قوم کی خیرخواہی اور اس کے اندر تحرک و بیداری کے حوالے سے ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ موصوف نے اپنی دیگر کاوشوں کے علاوہ، ۱۸۹۸ء میں "المسئلة الشرقیہ" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی، جس میں امت مسلمہ کے اجتماعی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے جرات و بے باکی اور دانش و بصیرت کے ساتھ اہل مصر اور ملت اسلامیہ کے خلاف مغربی سامراج کی چالبازیوں اور ریشہ دوانیوں کو بے نقاب کیا۔ مصطفیٰ کامل کے ہاں انگریزی استعمار کے چنگل سے رہائی، ملت میں روح جہاد کی بیداری اور اس سے کشاکش میں قوت ایمانی سے کام لینے کا جذبہ بہت واضح اور فراواں نظر آتا ہے۔ ہندستانی مسلمان بھی انگریزوں کی چیرہ دستیوں کا شکار تھے اس لیے قدرتی طور پر انھیں مصطفیٰ کامل کی آواز اپنے احساسات سے ہم آہنگ معلوم ہوئی۔ سرزمین فراعنہ کے اس ''بے مثل فرزند'' نے، جو بہ ظاہر ایک دبلا پتلا ضعیف الجثہ نوجوان تھا، ''مصر کے اولین داعی حریت'' کی حیثیت سے نوجوان صحافی اور ادیب سید ابوالاعلیٰ مودودی (عمر: ۲۱ سال) کو کچھ ایسا متاثر کیا کہ اس نے پہلے تو کامل پاشا کی شخصیت اور کارناموں پر ایک موثر و مفصل مضمون لکھا (جو زیر نظر کتاب میں بطور مقدمہ شامل ہے) پھر "المسئلة الشرقیہ" کا پورا ترجمہ شائع کرا دیا (سید مودودی نے اپنی کاوش "نگار" کے مدیر نیاز فتح پوری کو اشاعت کے لیے بھجوائی تھی، موصوف نے یہ ترجمہ اپنے نام سے چھاپ دیا۔ بعد ازاں منڈی بہاؤالدین کے رسالہ ''صوفی'' نے بھی اسے نیاز ہی کے نام سے شائع کیا)۔

اب ادارہ معارف اسلامی نے، متذکرہ بالا کتاب کو اس کی صحیح صورت میں منظرعام پر لانے کا اہتمام کیا ہے (مگر کتاب، پروف ریڈر کی مناسب توجہ سے محروم رہی ہے)۔ اہل مغرب خصوصاً امریکہ، ملت اسلامیہ کو اپنا غلام بنانا چاہتا ہے اور مسلم ممالک پر اپنا ورلڈ آرڈر مسلط کرنے کے درپے

ہے۔ زیر نظر کتاب ایک اعتبار سے امریکہ کی اسی مجنونانہ خواہش کا پس منظر واضح کرتی ہے۔ اس کے سرورق پر یہ ضمنی عنوان درج ہے: "انیسویں صدی کے آخر میں دولت عثمانیہ کی داستان زوال"

تاریخ کے طلبہ، خصوصاً اس کتاب کو بہت مفید پائیں گے۔ افسوس ہے قیمت درج نہیں۔ کتاب کے متعدد صفحات (ص ۲۷، ۸۰، ۸، ۱۳۸، ۱۵۴ وغیرہ) کی طباعت ناقص ہے۔ ص ۳۶ پر آیت قرآنی کا متن درست نہیں ہے۔ (ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)

اکیسویں صدی کی جانب (دو حصے): مرتبہ: حکیم محمد سعید۔ ناشر: ہمدرد فاؤنڈیشن پریس ناظم آباد کراچی ۷۶۰۰۰۔ صفحات اول ۴۰۴، دوم ۴۹۶۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔

حکیم محمد سعید صاحب کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ وہ اپنی ہمہ جہت سرگرمیوں کے ذریعے ملک و ملت کے لیے نہایت مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔ شام ہائے ہمدرد کا انعقاد بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ۱۹۹۲ء کے لیے شام ہمدرد کا موضوع "اکیسویں صدی کے لیے تیاریاں، صاحبان علم و حکمت کی راہ نمائیاں" متعین تھا۔ اس حوالے سے تقریباً سوا سو مقالے شام ہمدرد کی مجالس میں پیش ہوئے۔ جنھیں زیر نظر دو جلدوں میں مرتب کر دیا گیا ہے۔ اصحاب علم و دانش، ماہرین تعلیم و سائنس، ماہرین قانون و معیشت، مورخین و معالجین، معلمین، سفرا اور اہل سیاست نے اپنی اپنی دانست کے مطابق یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہمیں اکیسویں صدی کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے۔ بیشتر اصحاب نے نظام تعلیم میں انقلابی اصلاحات، شرح خواندگی میں اضافے، تعلیم بالغاں کی ترویج، سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی، نوجوانوں کی فکری صلاحیتوں کی نشوونما اور سادگی و کفایت شعاری اختیار کرنے پر زور دیا ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین، لکھنے والوں کے زندگی بھر کے مشاہدات، گہرے غور و فکر اور ان کے ذاتی تجربات کے آئینہ دار ہیں۔ یہ مضامین چونکہ مختلف ذہنوں کا نتیجہ فکر ہیں اس لیے خاصے متنوع اور دلچسپ ہیں اور بعض تو پر مغز بھی۔ بیشتر مقالہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ اخلاقی قدروں کا بحران ہی ہمارا اصل مسئلہ ہے۔

اخلاقیات کے مسئلے پر مغربی معاشروں کو مسلم ممالک سے کہیں زیادہ خطرناک صورت حال کا سامنا ہے چنانچہ بعض مقالہ نگاروں نے اہل مغرب کے اس احساس کا ذکر کیا ہے کہ اگر اکیسویں صدی اخلاقی اقدار کو اعتبار و استحکام نہیں بخشتی تو اس کے تمام تخلیقی کارنامے مزید فساد انگیزی کا سبب بنیں گے۔ جہاں تک امت مسلمہ کا تعلق ہے اس کی فلاح و کامرانی کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم اپنے اپنے معاشروں میں معروفات کو ماحول پر غالب کریں، منکرات کا قلع قمع کر دیں اور اس طرح ایک

پاکیزہ معاشرے کی تصویر پیش کر کے ساری دنیا میں ایمان اور اسلامی اقدار کو عام کر دیں۔ اس کے بغیر اکیسویں صدی کا 'کامیابی کے ساتھ' سامنا کرنا ممکن نہیں ہے۔ نامور سائنس دان ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے اپنے مقالے میں بڑی پتے کی بات کہی ہے کہ اگر امت مسلمہ اس دنیا میں غالب نہیں ہے تو وہ حقیقت میں ابھی پوری طرح مومن نہیں ہے۔ صدیقی صاحب کی اس بات کا ماخذ قرآن حکیم کی یہ آیت ہے: وَاَنتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنتُم مُّؤْمِنِيْنَ - لہٰذا مغز سخن یہی نکلتا ہے کہ ؂

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

اتنی بڑی تعداد میں معاشرے کے ممتاز اور دانش ور اصحاب کو جمع کر کے ان کے افکار و تجربات حیات کو تحریری صورت میں یکجا کرنے کی زیر نظر کاوش جناب حکیم صاحب کا ایک مستحسن اقدام ہے۔ بیشتر مقالے قارئین کو دعوت غور و فکر دیتے اور ان کے اندر کچھ نہ کچھ کرنے کی تحریک پیدا کرتے ہیں۔ کتاب سلیقے اور نفاست سے شائع کی گئی ہے۔ (ر - ہ)

The Emergence of Islam : محمد حمید اللہ ' مترجم: افضل اقبال۔ ناشر: اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پوسٹ بکس ۱۰۳۵ اسلام آباد۔ صفحات: ۲۸۶۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔

علوم اسلامیہ اور تاریخ کے نامور اسکالر ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ۱۹۸۰ میں اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور کی دعوت پر بارہ توسیعی خطبات دیے تھے جو کچھ عرصے کے بعد خطبات بہاول پور کے نام سے شائع ہوئے۔ زیر نظر کتاب انھی خطبات کا انگریزی ترجمہ ہے۔

خطبوں کے موضوعات: تاریخ قرآن' تاریخ حدیث' تاریخ فقہ' تاریخ اصول فقہ و اجتہاد' اسلامی قانون بین الممالک' دین (عقائد' عبادات' تصوف)' عہد نبوی ؐ میں مملکت اور نظم و نسق' نظام دفاع اور غزوات' نظام تعلیم' نظام تشریع و عدلیہ' نظام مالیہ و تقویم' تبلیغ اسلام اور غیر مسلموں سے برتاؤ سے ان کے موضوعاتی تنوع اور وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے تبحر علمی اور ذوق تحقیق میں کلام نہیں۔ یہ خطبات برجستہ اور تحریری حوالوں کے بغیر دیے گئے تھے مگر ڈاکٹر موصوف نے اپنے قوی حافظے' وسعت مطالعہ اور علمی ہنرمندی کے سبب جملہ موضوعات پر نہایت اطمینان بخش گفتگو کی ہے۔ ان کے انداز گفتار میں 'ایک بڑے عالم کا سا انکسار ملتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے ہاں کسی قسم کی ذہنی مرعوبیت نہیں ہے۔ بعض معاملات میں تو وہ خاصے Orthodox نظر آتے ہیں مگر کہیں کہیں وہ لبرل نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ بہرحال یہ خطبات' معارف اسلامیہ کا ایک قابل قدر خزینہ ہیں۔ آخر میں اشاریہ اور کتابیات شامل ہیں اور ایک تصحیح نامہ بھی

ترجمے ،تدوین اور اشاعت میں واضح طور پر ایک علمی معیار برقرار رکھنے کی کوشش قابل قدر اور باعث طمانیت ہے۔ (د - ۵)

اسلام کی اخلاقی تعلیمات : عرفان حسن صدیقی۔ ناشر: اسلامک پبلی کیشنز ۱۳ ای شاہ عالم مارکیٹ ،لاہور۔ صفحات: ۳۲۶۔ قیمت: ۸۰ روپے۔

یہ کتاب فضل سلمان ٹرسٹ کے زیر اہتمام ایک بڑے منصوبے کا اہم حصہ ہے۔ مکمل منصوبہ قرآن حکیم کا ایک موضوعاتی اشاریہ (subject - wise index) مرتب کرنا ہے تاکہ ایک ہی نظر میں یہ معلوم ہو جائے کہ رب علیم و حکیم نے انسان کی دنیوی و اخروی زندگی کی فلاح کے لیے کیا کیا احکامات و ہدایات قرآن حکیم میں کس کس جگہ پر دے دی ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف مکاتیب فکر کی نمایندگی کرنے والی ۱۲ تفاسیر سے استفادہ کیا گیا ہے۔

کتاب کا موضوع اخلاق اور تعمیر سیرت و کردار ہے۔ ابواب اور بعض ضمنی عنوان اس طرح ہیں: اسلام کا نظریہ حیات اور مقصد حیات۔ اسلام کے عباداتی ، معاشرتی ، معاشی ، معاملاتی اور ذاتی ضوابط اخلاق۔ بعثت رسول ؐ کے وقت کی اخلاقی حالت۔ اخلاق انبیاؑ ، اخلاق نبوی ؐ ، اخلاق صحابہ ؓ۔ فضائل اخلاق ، رذائل اخلاق۔ تاریخ انسانی سے اچھے اور برے کرداروں کی مثالیں۔

انداز پیش کش یہ ہے کہ ایک ایک موضوع کو لے کر اس کے بارے میں تمام قرآنی آیات ، اور ان کے علاوہ اکثر مقامات پر احادیث اور تاریخ اسلام سے منتخب ہدایات و واقعات شامل کیے گئے ہیں۔ درمیان میں کہیں کہیں مصنف نے اپنی طرف سے بھی کچھ وضاحتیں کی ہیں اور موضوعات کا تعارف کرایا ہے۔ اگر ایک موضوع کی کئی قرآنی آیات ہیں تو ان میں سے چند تو کتاب میں نقل کی گئی ہیں اور باقی کے صرف سورۃ نمبر اور آیت نمبر دیے گئے ہیں۔ لہٰذا بھرپور استفادے کے لیے ضروری ہے کہ قاری ، قرآن مجید کا ایک با ترجمہ نسخہ مطالعے میں ساتھ رکھے اور متعلقہ آیات کا مطالعہ کرتا رہے۔ اس اہتمام سے اس کتاب کا مطالعہ کرنے والا محسوس کرے گا کہ یہ کتاب قرآن کی تمام اخلاقی تعلیمات کو موضوع وار جاننے کے لیے ایک کنجی کی حیثیت رکھتی ہے۔

مجموعی طور پر اس کتاب کی عبارت صاف اور سلیس ہے۔ طباعت عمدہ ہے۔ فہرست میں عنوانات کے سامنے صفحہ نمبر درج نہیں ، یہ ایک قابل ذکر کوتاہی ہے۔ (ڈاکٹر بلال مسعود)

سفر شوق : فرید احمد پراچہ۔ ناشر: شہ تاج مطبوعات ، ۱۰/۲۸ بیس منٹ ، پیسہ اخبار مرکز ،لاہور۔

۔۱۴۔قیمت: ۲۵ روپے ۔

بارہ تیرہ سال پہلے جناب فرید احمد پراچہ کو سرزمین نجد و حجاز میں تین ماہ رہنے اور وہاں گھومنے پھرنے کا موقع ملا۔ وہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور انھیں سعودی عرب کے متعدد مقدس اور تاریخی آثار و مقامات دیکھنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ پراچہ صاحب کی آنکھ نے جو کچھ دیکھا' دل نے جو محسوس کیا اور روح نے جن کیفیات کو جذب کیا "سفر شوق" میں انھیں متوازن انداز اور رواں دواں اور خوب صورت اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ "احساسات و تاثرات کا یہ مجموعہ واردات قلبی کا حقیقی آئینہ دار ہے"۔

"سفر شوق" مصنف کے سفر حج کی پر تاثیر اور دل گداز داستان ہے جس میں دیباچہ نگار کے بقول: "مناظر سفر کا مشاہدہ بھی ہے' تاریخ رفتہ کے ابواب کی سیر بھی اور موجودہ حالات کا تجزیہ بھی اسے پڑھنے سے ایمان بھی سیراب ہوتا ہے اور دماغ کو معلومات بھی ملتی ہیں"۔

زیر نظر دوسرے ایڈیشن میں مصنف نے اپنے سفر عمرہ (۱۹۹۳) کا مختصر تذکرہ بھی شامل کر دیا ہے۔ آخر میں مناسک حج و عمرہ کی تفصیل بھی منسلک ہے۔ اس طرح یہ کتاب عازمین حج کے لیے استفادے کا باعث ہوگی۔ حج بیت اللہ سے لوٹنے والے بھی اس کے مطالعے میں قند مکرر کی سی لذت و شیرینی محسوس کریں گے۔ (ر - د)

Letters to the Editor: made easy : مظہر علی ادیب۔ ناشر: الادیب انگلش اکیڈمی' ۲۵۹ جہاں زیب بلاک' علامہ اقبال ٹاؤن' لاہور۔ صفحات: ۱۹۲۔ قیمت: ۳۰ روپے۔

اسلامیات' تعلیم' سیاسیات' ذرائع ابلاغ' مقام نسواں اور سماجی برائیوں کے مختلف پہلوؤں پر گذشتہ ۲۵ برس میں اخبارات اور رسائل میں شائع ہونے والے مختصر مراسلات کا ایک مفید مجموعہ جو' بی اے' بی ایس سی کے طلبا کے لیے معاون و مددگار اور انگریزی میں لکھنے کی مشق کرنے والوں کے لیے راہ نما ہو سکتا ہے۔ (ر - د)

مقتل بوسنیا و کشمیر: ظہور الدین بٹ۔ ادارہ مطبوعات سلیمانی' رحمان مارکیٹ' اردو بازار' لاہور۔ صفحات: ۱۳۰۔ قیمت: ۲۲ روپے۔ کشمیر' بوسنیا' فلسطین اور برما کے حوالے سے آسان زبان میں ۹ کہانیاں۔ مصنف تاریخی حقائق کو افسانہ و تخیل سے آمیز کر کے کہانی پیش کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ سکول کے بچوں کے لیے ایک مفید اور معلومات افزا کتاب۔

احب پارہ
ملتان روڈ لاہور

گلشن احباب
فیز I ملتان روڈ لاہور

گلشن احباب
فیز II لنک فیروزپور روڈ لاہور

منظر کوہسار
اسلام آباد

شاداب کالونی
فیروزپور روڈ لاہور

پانچ رہائشی منصوبوں کی شاندار کامیابی کی حامل اور آپ کے کامل اعتماد کی مظہر

احباب ہاؤسنگ سوسائٹی (پرائیویٹ) لمیٹڈ



اسلام آباد سے متصل مرگلہ ہلز کے
حسین دامن میں ایک نیا دلپذیر شہر

منظرِ کوہسار

ترقیاتی کام جاری ہیں

ہاؤسنگ اینڈ فزیکل پلاننگ حکومت پنجاب اور ڈسٹرکٹ کونسل راولپنڈی سے منظور شدہ سڑکیں سیوریج، بجلی، پانی، سکول، کمیونٹی سنٹر، قبرستان مسجد اور ہسپتال، خوبصورت جھیل

30 اگست 95 سے پہلے بکنگ کرانے پر قیمت 22 ہزار روپے فی مرلہ 3 ہزار روپے فی مرلہ کے حساب سے ڈرافٹ بھیج کر بکنگ کرالیں، باقی رقم تین سال کی قسطوں میں

کنال: 20 مرلہ 600 مربع گز

فیروزپور روڈ پر چونگی امر سدھو سے ۲ کلومیٹر

ایل ڈی اے سے منظور شدہ

شاداب کالونی

کشادہ سڑکیں، خوبصورت پارکیں، مسجد ڈسپنسری، سکول، مارکیٹیں، ٹیلیفون اور سوئی گیس کی سہولت موجود۔ سکول کالج اور بڑے ہسپتال قریب تر ترقیاتی کام جاری ہیں۔ کنال: ۵۰۰ مربع گز

30 اگست 95 سے پہلے بکنگ کرانے پر قیمت 25 ہزار روپے فی مرلہ 3 ہزار روپے فی مرلہ کے حساب سے ڈرافٹ بھیج کر بکنگ کرالیں — باقی رقم تین سال کی قسطوں میں

گلشن احباب فیز II لنک فیروزپور روڈ میں کشادہ پلاٹوں کی بکنگ جاری ہے

شاداب کالونی فیروزپور روڈ میں کمرشل پلاٹوں کی بکنگ جاری ہے

تحریک اسلامی سے
وابستہ افراد کا با اعتماد ادارہ

احباب ہاؤسنگ سوسائٹی پرائیویٹ لمیٹڈ

بٹ ہاؤس 1 اے فیض روڈ اولڈ مسلم ٹاؤن لاہور

فون: 5869549-5865371 فیکس: 5837016

احباب ہاؤسنگ

مدیر کے نام

ڈاکٹر محمد ذکاء اللہ، قائداعظم یونی ورسٹی اسلام آباد

قرآن و حدیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ چہرے کے پردے کے احکامات (چند مشورے، جون ۹۵) کہیں موجود نہیں ہیں اور نہ ہی نبی اکرم ؐ کے دورِ باسعادت میں اس کے آثار ملتے ہیں۔ بدقسمتی سے انسانی رویہ عورت کے معاملے میں بالخصوص افراط و تفریط کا شکار رہا ہے۔ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیے اور جو پابندیاں لگائیں وہ بھی افراط و تفریط سے محفوظ نہ رہ سکیں مثلاً (۱) اسلام نے عورت کو وراثت میں حصہ دار بنایا جو ہمارے معاشرے کی ۹۹ فی صد خواتین کو حاصل نہیں ہے۔ بقیہ ایک فی صد خواتین میں بھی اکثر کو شرعی حصہ دینے کی بجائے برائے نام حصہ دے کر ٹرخا دیا جاتا ہے۔ (۲) نبی اکرم ؐ نے علم حاصل کرنا مسلمان مردوں اور عورتوں پر فرض قرار دیا تھا لیکن ہمارے ہاں کہیں فتنے کے انسداد اور کہیں دینی غیرت کے نام پر انھیں حصولِ علم کے لیے گھر سے باہر جانے سے روکا جاتا ہے۔ (۳) نبی اکرم ؐ نے لڑکیوں کی رائے لیے بغیر ان کا نکاح کرنے سے منع کیا تھا لیکن پاکستانی معاشرے کی ۹۰ فی صد سے زائد لڑکیوں کے رشتے ان کی رائے لیے بغیر ان پر ٹھونسے جاتے ہیں۔ (۴) نبی اکرم ؐ نے جمعہ اور عیدین کی نماز میں خواتین کو نماز میں شریک ہونے اور خطبہ سننے کی تاکید کی تھی۔ ہم نے انسدادِ فتنہ کے نام پر انھیں مسجد آنے سے روک دیا ہے۔ (۵) نبی اکرم ؐ نے تو یہ فرمایا تھا کہ جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کے چہرے اور ہاتھ کے علاوہ جسم کا کوئی حصہ نظر نہ آئے۔ ہم نے افراط کے رویے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا منہ، ناک اور کسی حد تک آنکھیں بھی ڈھانپ دیں۔

معاف کیجیے گا کہیں روایات، کہیں غیرت اور کہیں انسدادِ فتنہ کے نام سے مسلم معاشرے میں خواتین پر غیر شرعی پابندیاں عائد کی گئی ہیں، اور ان کا سلسلہ صدیوں پر محیط ہے۔ ہم ہمیشہ اسلام میں عورت کو دیے گئے حقوق کی بات کرتے ہیں لیکن ذرا یہ تو بتایئے کہ یہ حقوق حاصل کن خواتین کو ہیں بلکہ جن گھرانوں و علاقوں میں مذہب سے روایتی عقیدت و وابستگی زیادہ ہے، وہیں بالعموم خواتین پر غیر شرعی ظلم کا سلسلہ بھی زیادہ دراز ہے۔ چہرے کا پردہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو نبی اکرم ؐ کے دور میں پیش نہیں آیا، اور بعد میں اس موضوع پر اجتہاد کی ضرورت پیش آئی ہو۔ خدارا! اپنے علما و مشائخ کو اپنا الٰہ اور شارع نہ بنایئے کہ یہ اللہ کو پسند نہیں ہے۔

مظہر علی ادیب 'لاہور

اگرچہ قرآن میں 'نقاب' کا لفظ نہیں ہے تاہم حدیث میں 'نقاب' کا لفظ ملتا ہے (چند مشورے ' جون ۹۵)۔اس دور کے شعرائے کرام کے اشعار میں 'نقاب' اور نقاب کے ہم معنی الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔پاؤں کے زیورات کی جھنکار اور آواز کے حسن کا تو پردہ ہو (النور ۲۴: ۳۱-احزاب ۳۳: ۳۲) اور جسم کے سب سے زیادہ پرکشش حصے یعنی چہرے کا پردہ نہ ہو' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ قرآن "زینت" چھپانے کا صاف حکم دیتا ہے 'کیا عورت کے خوبصورت بال' ماتھے 'کان اور ناک کا زیور زینت نہیں؟ کیا کریم پاؤڈر' ہونٹوں کی سرخی' آنکھوں کا سرمہ اور طرح طرح کا دوسرا "میک اپ" زینت نہیں؟ یقیناً یہ سب کچھ "زینت" ہے اور اسے چھپایا جانا ضروری ہے۔عورتوں کو نقاب کے ساتھ ان تمام "زینتوں" کا حق دینا بہتر ہے اور زیادہ قابل عمل ہے یا نقاب ختم کر کے انھیں ان تمام "زینتوں" ہی کے حق سے محروم کرنا؟ مغربی ممالک کی عورتیں سخت سردی کی وجہ سے پورے جسم پر دو دو اورکوٹ پہنتی ہیں 'کیا آپ اسے "شرعی پردہ" کہیں گے؟ درحقیقت چہرے کے پردے کے بغیر "اسلامی پردہ" کا تصور مکمل نہیں ہوتا۔

پردے کی پابند خواتین نے اپنی زندگیوں میں عظیم الشان کارنامے سرانجام دے کر یہ بات ثابت کر دی ہے کہ شرعی حجاب عورت کی حقیقی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے۔آج بھی ۴ سے زیادہ لیڈی ڈاکٹرز لاہور کے شفاخانوں میں برقع کے ساتھ' صرف آنکھیں بے نقاب کر کے' مریضوں کا آپریشن تک کر رہی ہیں۔ربوہ کے ایک شفاخانے میں تمام نرسیں اور ڈاکٹرنیاں باقاعدہ برقع پہن کر ڈیوٹیاں دیتی ہیں۔گو ایران میں نقاب کی پابندی نہیں ہے 'تاہم ایرانی عورتیں اپنی پوری پیشانی 'کان' رخساروں کی اطراف اور ٹھوڑی چھپاتی ہیں یعنی صرف "چہرے کی ٹکیہ" کھلی رکھتی ہیں - لیکن اتنی "بے نقابی" بھی اس امر سے مشروط ہے کہ وہ چہرے کا میک اپ نہیں کر سکتیں۔

منظور احمد چنیوٹی 'لندن

یہاں دیار غیر میں آپ کا مضمون توہین رسالت کا حالیہ مقدمہ پہلے روزنامہ جنگ 'لندن میں پھر برمنگھم میں ترجمان القرآن میں پڑھا۔آپ نے جس اسلامی جذبے اور عشق نبوی ؐ سے سرشار ہو کر جس موثر انداز میں یہ تحریر کیا ہے دل چاہا کہ آپ کو اس مدلل اور مبنی برحقیقت مضمون پر دل کی گہرائیوں سے ہدیہ تبریک پیش کروں۔آپ نے پوری مسلم امہ کی نمایندگی کرتے ہوئے ترجمانی کا صحیح حق ادا کر دیا ہے۔اور معترضین کے شبہات کا بھی مدلل اور مُسکِت جواب دے کر اتمام حجت کر دی ہے۔فجزاکم اللہ احسن الجزاء

ہر محفل کا میزبانِ خصوصی

رُوح افزا

تقریب کی نوعیت پر منحصر نہیں۔ کوئی موقع ہو، کیسی ہی محفل ہو،
ضیافت اور مہمان نوازی کے لیے رُوح افزا پیش پیش۔

فرحت، تازگی اور توانائی کے لیے بے مثال
رنگ، خوشبو، ذائقے، تاثیر اور معیار میں لازوال۔



روحِ پاکستان ۔ رُوح افزا
راحتِ جان ۔ رُوح افزا

ہمدرد
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں

خدمتِ خلق رُوحِ اخلاق ہے

ADARTS HMD-6/87

REGD. NO. L 5340

PHONES : 7587916
7585590

MONTHLY **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE